Fikr-o-Nasar (Islamabad) 17:5-6 (1979)

اسلام کا نظام حکومت و طریق انتخاب، اولی الامر

حافظ محمد لطیف

اسلام کا نظام حکومت صدارتی یا پارلیمانی وحدانی یا وفاقی، مشاورتی یا وفاقی مطلق العنان یا جمہوری یا آمرانہ یک جماعتی یا دو جماعتی۔

اولی الامر کا انتخاب عوام کریں یا اہل الرائے (تعلیم یافتہ) اور متقی حضرات کریں۔

مسلمانوں کے حکمرانوں کا انتخاب بالغ رائے دہی کے ذریعے اکثریت کی بنار پر ہونا چاہیے یا چند با اثر و رسوخ یا مقتدر افراد کی رائے یا پسند کے مطابق ہونا چاہیے۔

اسلامی نظام کے تحت کسی عہدہ یا منصب کے لئے امیدواروں کو اپنے آپ کو پیش کرنا جائز ہے یا نہیں ؟

اسلامی نظام میں ایک سے زیادہ سیاسی جماعتیں ہو سکتی ہیں یا نہیں ؟

کیا اس وقت وہی اطوار و طریقے اور افعال اختیار کئے جا سکتے ہیں جو عہد نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) یا خلافت راشدہ کے دوران موجود تھے۔ یا حالات و زمانہ کے تابع اسلام کے اصول اجتہاد کے ذریعے ان میں تبدیلی ہو سکتی ہے اگر تبدیلی ہو سکتی ہے تو کن اصولوں کے تحت کس حد تک اور کن مصالح اور مقاصد کے تحت ہو سکتی ہے۔

یہ تمام مسائل ایسے ہیں کہ اس وقت تقریباً ہر مجلس، ہر طبقہ اور ہر کس و ناکس کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ اہل علم و دانش حضرات میں سے بعض ممتاز حضرات نے تو یہاں

تک ادعا کر دیا ہے کہ اسلام میں صرف ایک جماعت (حزب اللہ) کے علاوہ کسی دیگر جماعت کے وجود کا کوئی جواز نہیں اور اس سے اختلاف رائے رکھنے والے افراد کی اسلامی معاشرے میں کوئی گنجائش نہیں۔ اس کی بنا پر عوام الناس کی اکثریت کے اذہان میں طرح طرح کے شکوک و شبہات ابھر رہے ہیں جس سے اسلام کے بارے میں یہ تاثر پیدا ہو رہا ہے کہ شاید عصر حاضر میں اسلام قابل عمل نہیں ہو سکتا۔ افسوس کا مقام یہ ہے کہ اس مہم میں ملک کے بعض اہم قومی اخبارات بھی پیش پیش ہیں اور اس بات کی وکالت کر رہے ہیں کہ عوام الناس کو اپنے حکمرانوں کے چناؤ کا اختیار ہے نہ ہونا چاہیئے۔

اسلام بلاشبہ مکمل ضابطۂ حیات اور ایک عالمگیر فلاحی نظام ہے جو ہر زمانہ، قوم، ملک، وطن اور اقوام کے لئے کامل راہ نجات ہے۔ اس میں ہر مسئلہ کا حل اور مرض کا مداوا موجود ہے لیکن افسوس کہ اس کو بروئے کار لانے کے لئے طبیب نہیں ملتا جو اس کے استعمال سے اس بیمار قوم کو صحت یاب ہونے کی راہ دکھا دے اس پر اس وقت حکیمان حذاق کے بجائے عطائی حضرات اپنی دکانداری چمکا رہے ہیں افسوس وہ بزرجمہر حضرات جو قومی وحدت کے نام سے یک جماعتی معاشرہ کا راگ الاپ رہے ہیں اس کی آڑ میں وہ ہر قسم کے اظہار اختلاف پر پہرے بٹھانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ عوام کو اسلام کے قریب لانے کے بجائے اسلام سے دور کرنے کا باعث ہو رہے ہیں۔ مکمل رواداری کے حامل اور ہر قسم کے جبر و اکراہ سے پاک دین کو یک جماعتی معاشرہ کا حامی ثابت کر کے لوگوں میں اسلام کے بارے میں ذہنی انتشار پیدا کیا جا رہا ہے جو یقیناً اسلام کی خدمت نہیں بلکہ عداوت ہے۔

پچھلے دنوں "شام ہمدرد" میں ان موضوعات پر مقالے بھی پڑھے گئے اور بعض اخبارات میں اظہار خیال بھی کرایا گیا بلکہ چند ایک قومی اُردو اخبارات نے تو اہل قلم علمائے کرام اور دانشوروں کا سوالنامہ کی صورت میں اس پر اظہار خیال شائع کرنے کا اہتمام بھی کیا لیکن افسوس ان میں سے کسی ایک مقالہ نگار نے بھی صرف ایک آدھ پہلو پر سطحی سے دلائل کے علاوہ کوئی ٹھوس

علمی یا تحقیقی بحث نہیں کی۔ حالانکہ راقم کے خیال میں یہ مسائل اتنے پیچیدہ ہیں نہ مشکل سوائے اس کے کہ یک جماعتی معاشرے کے حامی اصل میں جو بات کہنا چاہتے ہیں وہ زبان پر لانے کی بجائے دل میں رکھ کر بات کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کا مدعا کھل کر واضح ہونے کے بجائے مسئلہ کو اور زیادہ الجھا دیتا ہے۔

اسلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنی نوع انسان کے لئے اس کرۂ ارض کے باسیوں کے لئے آنے والی ہدایات کی آخری کڑی ہے۔ آفرینش آدم گویا پیدائش انسانیت تھی۔ جس طرح بچے کو کم سنی میں قدم قدم پر بڑوں کی راہنمائی اور نگہداشت کی احتیاج ہوتی ہے اسی طرح اس نونہال انسانیت کی اللہ تعالیٰ نے رہنمائی کے لئے ہادی اور راہنما بھی بھیجے جو اس کی ہر ضرورت اور حالت میں پیشوائی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ عہد رسالت مآب (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تک پہنچ کر نوع آدم عہد شباب کو پہنچ گئی گویا ضرورت باقی نہ رہی۔ جس طرح جوان ہونے پر کسی کو بڑوں کی انگلی پکڑ کر چلنے کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ یہ شعور کی اس منزل تک پہنچ چکی تھی جب خود اپنی راہیں متعین کرنے کے لئے کسی عاقل بالغ شخص کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس کے لئے اتنا ہی کافی ہوتا ہے کہ اس کی تعلیم و تربیت صحت مندانہ اور صالح انداز میں ہوئی ہو اس کے بعد اس کو کسی خارجی روشنی کی ضرورت رہتی ہے نہ پاسبان کی بس پاسبان عقل کے ساتھ نور ہدایت کا چراغ دیکر۔

"درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ ای" کرکے تلاطم حیات کے تھپیڑے کھانے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تکمیل مشن کے بعد بنی نوع انسان کو دوسروں کی انگلی پکڑ کر چلنے کی ضرورت نہ رہی۔ حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کی ہدایت کا مدار صرف دو ہی چیزیں قرار دیں۔ آپ نے فرمایا کہ "میرے بعد جب تک تم دو چیزوں کو مضبوطی سے پکڑے رہوگے تم کبھی بھی گمراہ نہ ہوگے"(۱)

۱۔ لن تضلوا ما ان تمسکتم بھما کتاب اللہ و سنۃ رسولہ (مشکوٰۃ حدیث نمبر ۱۵۵ ج ۱)

کتاب اللہ و سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تا قیامت پیش آنے والے تمام حالات و حادثات کا احاطہ ممکن نہیں تھا[۲] نہ ہی قیامت تک کی حیات انسانی کی تمامتر جزئیات کا تعین مناسب ہو سکتا تھا۔ تاہم جو ضروریات اور اصول دین ہر زمانہ، قوم اور وطن کے لئے اٹل اور غیر متبدل تھے قرآن و سنت میں ان کا ذکر کر دیا گیا جو ضروریات اور اساسیات دین اس زمرے میں نہیں آتے تھے ان کا ذکر ضروری نہ سمجھا گیا۔ چنانچہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں کہیں بھی یہ نہیں ملے گا کہ ملت مسلمہ کو اپنے حکمرانوں کا چناؤ کیسے کرنا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد خلیفہ کے چناؤ پر انصار اور مہاجرین میں باہم اختلاف پیدا ہوا۔[۳]

اس امر کی بھی قطعاً کوئی ہدایات نہیں تھیں کہ فلاں آدمی کو خلیفہ مقرر کیا جائے فلاں طریق پر اس کا انتخاب کیا جائے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے وصال کے وقت امت مسلمہ نے اپنی صوابدید کے مطابق خلیفۂ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)، ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتخاب کر لیا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی وفات سے قبل حضرت عمرؓ کو خلیفہ نامزد فرما دیا۔[۴] حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے اوپر قاتلانہ حملے کے بعد سات جلیل القدر صحابہ کرام کا ایک

۲۔ ملاحظہ ہو تلویح ص۵ (لا ادراج حکم کل حادثہ فی القرآن)

۳۔ (ا) ملاحظہ ہو سیرت النبی ابن ہشام صفحہ ۸۰۸ جلد ۲۔ سقیفہ بنی سعدہ میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صدیق کے چناؤ کے بارے میں صحابہ کرام میں اختلاف پیدا ہو گیا۔

(ب) ملاحظہ ہو تاریخ طبری۔ سیرت النبی ابن ہشام ص ۹۴۵، ۹۵۰۔

۴۔ بعض مؤرخین کا کہنا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت عمرؓ کی نامزدگی سے قبل بعض اہل الرائے اور جلیل القدر صحابہ کرام سے آپ کے خلیفہ بنانے کے بارے میں مشورہ کیا تھا۔ تاہم پھر یہ بھی کہیں نہیں ملتا کہ یہ مشورہ بہت زیادہ تعداد میں صحابہ کرام سے کیا گیا ہو۔ (ترجمہ تاریخ طبری جلد ۲ صہ ۲۶۳)

پینل نامزد کر دیا تھا جن میں سے خلیفہ کا چناؤ ہونا تھا۔[۵] حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد مدینہ منورہ کے اصحاب الرائے نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلیفہ چن لیا۔[۶] حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد اصحاب دارالخلافہ (کوفہ) نے آپ کے فرزند حضرت حسن علیہ السلام کو آپ کا جانشین مقرر کیا۔ جنہوں نے چھ ماہ تک خلافت چلا کر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور اقتدار ان کو سونپ دیا۔ اس طرح خلافت راشدہ کے دوران یونان کی شہری ریاستوں کے طریق انتخاب کی طرح شہری مجمع گاہ میں چناؤ (حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ کی تقرری) نامزدگی (حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی) اتفاقیہ (حضرت عثمان غنیؓ) اور باپ کے بعد بیٹے کی جانشینی (حضرت حسن علیہ السلام کا چناؤ) اور دو حکمرانوں میں مصالحت (حضرت حسن علیہ السلام اور امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے ذریعے حکمرانوں کے تقرر کی مثالیں ہمیں ملتی ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اسلام نے اولی الامر کے چناؤ کے سلسلے میں کوئی ایک خاص متعین طریق کار نہیں بتایا۔ نہ ہی کسی طریق کار کی ممانعت کی ہے۔ بلکہ اس معاملہ کو ان معاملات کی طرح چھوڑ دیا ہے جن میں امت مسلمہ کی اکثریت حالات زمانہ اور ضروریات کے مطابق فیصلہ کر سکتی ہے۔ بشرطیکہ وہ اسلام کے کسی صریح حکم کے منافی نہ ہو گویا یہ مسئلہ ہمارے لئے "مباح"[۷] کی ذیل میں آتا ہے۔ جس میں حسب ضرورت

۵۔ یہ اصحاب حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، عبدالرحمان بن عوف حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور سعد بن ابی وقاص تھے۔ ساتویں حضرت عبداللہ بن عمرؓ تھے حضرت عمرؓ ان کے بارے میں یہ تصریح کر گئے تھے کہ مشورہ میں یہ شریک ہوں گے مگر امیدوار اقتدار و خلافت نہیں ہوں گے۔ (ملاحظہ ہو سیرت خلفائے راشدین از معین الدین ندوی طبری جلد سوم صفحہ ۲۴۲، ۲۴۳)

۶۔ خلفائے راشدین از معین الدین ندوی و تاریخ طبری۔ جلد سوم صفحہ ۲۴۲، ۲۴۳۔

۷۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے عن سلمان الفارسی۔ الحلال ما احل الله فی کتابه والحرام ما حرمه الله فی کتابه وما سکت عنه فهو مما عفی عنه وفی روایة ما احل الله فی کتابه فهو حلال وما حرمه فهو حرام وما سکت عنه فهو عفو فاقبلوا من الله عافیته رواه ابن ماجه والترمذی۔"

وقت اولی الامر کو فیصلہ کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔

غیر منصوص معاملات کے بارے میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا معمول۔

اس موقع پر اس امر کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا زندگی بھر یہ معمول رہا کہ جب کسی چیز کے بارے میں قرآن میں کوئی حکم نہ ہوتا تو اس کے بارے میں صحابہ کرام سے مشورہ فرماتے۔[۸] چنانچہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سیرت طیبہ سے کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں پیش کیا جا سکتا کہ کس معاملہ پر قرآن کا کوئی حکم موجود نہ ہو۔ اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے صحابہ کرام سے مشورہ کے بغیر اپنی رائے صحابہ کرام پر مسلط کی ہو۔ معاملات میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مشورہ کئے بغیر کبھی عمل

۸۔ قرآن کریم میں "وشاورھم فی الامر" آل عمران (اے پیغمبر علیہ السلام) آپ ان سے معاملات حکومت میں مشورہ کیا کیجئے کے الفاظ بصیغہ امر آئے ہیں۔ اسی طرح سورہ شوریٰ میں "وامرھم شوریٰ بینھم" ان (مسلمانوں) کے معاملات شوریٰ سے چلتے ہیں کے الفاظ حقیقت حال کے شاہد ہیں۔ جن سے خود اس امر کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کے باہمی فیصلے مشورہ سے طے پاتے ہیں۔ ادنیٰ سی سمجھ کا مالک بھی اس بات کے سمجھنے سے عاری نہیں ہو سکتا کہ جب باری تعالیٰ گواہی دے رہے ہیں کہ مسلمانوں کے امور مشورہ سے طے پاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ چند افراد کی رائے کا اس معاشرہ میں سکہ چلتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ ما رأیت احدا اکثر مشورۃ لاصحابہ من النبی صلی اللہ علیہ وسلم (ترمذی الجہاد)، بخاری شریف (کتاب السنتہ فتح الباری ج ۲ صفحہ ۲۸۶)

حضرت قتادہ کا قول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو من جانب اللہ حکم تھا کہ اہم معاملات (امر) میں اپنے اصحاب سے مشورہ کیجئے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اس حکم کی قوت و تاکید کو محسوس فرماتے اور اس کی تعمیل لازمی سمجھتے تھے۔ حضرت عائشہ بھی فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ لوگوں سے رائے اور مشورہ لینے والا کوئی انسان نہیں دیکھا۔ حضرت ابوبکر صدیق نے تحریری طور پر حضرت عمر کو ہدایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شوریٰ پر عامل تھے۔ تم بھی لازماً اس پر عمل کرنا۔ ضحاک کا بیان ہے کہ فاروق اعظم نے عورتوں کو بھی حق رائے دہی دیا تھا۔ اور وہ معاملات میں ان کی رائے بھی لیتے تھے۔

(اسلام کا نظام حکومت۔ از مولانا حامد الخانزی الانصاری صفحہ ۳۰۴، ۳۰۳)۔

نہیں کیا۔(۹) بلکہ "وشاورھم فی الامر" کے الفاظ اس امر کے شاہد ہیں کہ مشاورت نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کا اپنا معمول نہیں تھا بلکہ آپ اس کے لئے مامور تھے۔ نہ صرف آپ خود صحابہ کرام سے غیر منصوص معاملات میں مشورت ضروری سمجھتے تھے بلکہ صحابہ کرام کو بھی اس کی پابندی کی تاکید کرتے تھے۔ چنانچہ جب حضرت علی کو عامل یمن بنا کر بھیجا تو آپ نے حضرت علیؓ سے استفسار فرمایا۔ جب تمہارے پاس کوئی تصفیہ طلب معاملہ آیا تو اس کا فیصلہ تم کیسے کروگے تو حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ کتاب اللہ سے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر اس کا جواب اس میں نہ ہوا تو حضرت علیؓ نے جواب دیا" سنت سے" آپ نے فرمایا اگر اس میں بھی اس کا حل نہ ہوا تو آپ نے فوراً خود ہی رہنمائی فرمائی کہ ایسی صورت میں تم وہاں کے اہل بصیرت حضرات کے مشورہ سے اس کا حل تلاش کرنا۔(۱۰)

۹۔ مثلاً مقام بدر کا انتخاب، اسیران بدر سے سلوک، ہدیہ لے کر ان کی رہائی اور جان بخشی۔ جنگ خندق کے موقع پر مقابلہ کہاں اور کیسے کیا جائے۔ جنگ احد کہاں لڑی جائے، شوریٰ حدیبیہ شوریٰ افک شوریٰ اسیران بنی ہوازن، شوریٰ اذان شوریٰ معاذ بن جبل (اسلام کا نظام حکومت صـ۲۰) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ ایسے معاملات میں جو مسلمانوں کے عام معاملات سے متعلق ہوتے تھے۔ اور جن میں وحی کی ہدایت موجود نہ ہوتی مسلمانوں سے مشورہ کرتے۔ مثلاً آپ ہر جنگ کے موقع پہ اور جنگ کے بعد آنے والے حالات میں اور حکومت کے دوسرے معاملات میں جن میں کوئی نص نہ ہوتی مسلمانوں سے مشورہ کرتے آپؐ کے بعد خلافت راشدہ کے دور میں بھی صحابہ کرام نے ایسا کیا۔" (خلافت کے مسئلہ میں جمہور کا مسلک ترجمان القرآن جلد ۶۰ شمارہ ۳، ۱۹۶۳ء

۱۰۔ ملاحظہ ہو حوالہ ذیل فقہ الاسلام از حسین احمد الخطیب ص ۲۲ اردو ترجمہ)

حضرت سعید بن المسیب حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعض دفعہ ہمارے سامنے ایسا مسئلہ پیش ہوتا ہے جس کا ذکر کتاب وسنت میں موجود نہیں ہوتا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا ایسی صورت میں عالم اور عابد مسلمانوں کو جمع کرو اور اس معاملے کو ان کے سامنے مشورہ کے لئے پیش کرو اور کسی ایک کی رائے پر فیصلہ نہ کرو۔

مشورت کے سلسلے میں خلیفہ اول کا طریق کار

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے عہد خلافت میں امور خلافت کے سلسلے میں جہاں قرآن و سنت سے کوئی ہدایت نہ ملتی وہاں مجلس شوریٰ سے مشاورت فرماتے۔ مثلاً جمع قرآن مجید، اپنی تنخواہ کے تعین اور اسی طرح کے دیگر معاملات میں جہاں قرآن و سنت کی کوئی رہنمائی نہ تھی، آپؓ نے صحابہ کرام سے باقاعدہ مشورہ کیا۔(۱۱)

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں بھی حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرح عمل ہوتا رہا۔ مثلاً محصول چنگی کے نفاذ، حد شراب نوشی میں اضافہ اور عراق کی مفتوحہ زمینوں کے حق ملکیت کے مسئلے کے علاوہ متعدد دیگر امور کے بارے میں ایسی مجالس مشاورت برپا ہوئیں۔(۱۲)

۱۱۔ امام بغوی نے میمون بن مہران کی اس روایت کا ذکر کیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے جب مقدمات پیش ہوتے تھے تو ان کے فیصلہ کے لئے وہ کتاب اللہ کا مطالعہ کرتے تھے۔ اگر وہاں کوئی حکم مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے تھے اور اگر کتاب اللہ میں کوئی حکم نہیں ملتا تھا تو اس کے متعلق رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کوئی حدیث مل جاتی تھی۔ تو وہ اس کے مطابق فیصلہ صادر فرماتے تھے۔ لیکن اگر وہاں بھی کوئی مسئلہ نہ ملتا تھا تو آپؓ مسلمانوں سے پوچھتے تھے کہ میرے سامنے یہ مسئلہ درپیش ہے۔ کیا تمہیں اس بارے میں کوئی حدیث معلوم ہے؟ اس سوال کے جواب میں بعض اوقات سب مل کر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کوئی حدیث بیان کرتے تھے مگر بعض دفعہ کوئی حدیث نہیں ملتی تھی تو آپؓ بہترین اہل الرائے اور اہل علم کو جمع کرتے ان سے مشورہ کرتے تھے جب وہ کسی بات پر اتفاق کر لیتے تھے تو آپ اس کے مطابق فیصلہ کرتے تھے۔ (ایضاً ص ۲۲۱)

حضرت صدیق اکبرؓ کے زمانے کے چند اہم واقعات شوریٰ درج ذیل ہیں۔

۱۔ جیش اسامہ کے بارے میں لوگوں کی رائے لی گئی۔

۲۔ شوریٰ مانعین زکوٰۃ۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے وصال کے بعد بعض قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا تو صدیق اکبرؓ نے اس معاملہ کو بحث کے لئے رائے عامہ کے سامنے پیش کیا (ایضاً)

۳۔ حضرت عمر فاروقؓ کے تقرر کے بارے میں آپ نے مجلس حکومت سے مشورہ کے بعد معاملہ عامۃ المسلمین کے سامنے پیش کیا۔ علاوہ ازیں جمع قرآن اور مرتدین سے جنگ کے بارے میں آپ کے مشورہ (باقی اگلے صفحہ پر ملاحظہ)

سطورِ بالا کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام میں اربابِ اقتدار کے چناؤ کا کوئی ایک خاص طریق متعین نہیں بلکہ یہ سب کچھ حالاتِ زمانہ کے مطابق ملتِ مسلمہ پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ خلافتِ راشدہ کے دوران خلیفہ کے چناؤ کے سلسلے میں کسی نہ کسی طریق پر عوام کی تائید حاصل کر لی (بذریعہ بیعت خواہ خلیفہ کے زمامِ اختیار سنبھالنے کے بعد ہی ہوئی ہو) جاتی تھی۔ اموی اور عباسی ادوار میں خالصتاً نامزدگی اور موروثی سلسلہ جاری ہو گیا اور[۱۳] علمائے کرام یا فقہائے عظام کے معمولی سے اختلافِ رائے یا بسا اوقات حکومت کے ساتھ عدمِ تعاون[۱۴] کے علاوہ کوئی خاص قابلِ ذکر اختلاف کا ثبوت نہیں ملتا۔ بلکہ اس کے برعکس علمی اور دینی حلقوں میں اکثریت ایسے اصحابِ علم و دانش کی رہی ہے جو خلیفہ وقت (خواہ اس نے اقتدار پر غاصبانہ ہی قبضہ کیا ہو) کے اقتدار مستحکم ہونے کی صورت میں اس کے خلاف خروج کو ناپسندیدہ بلکہ ناجائز قرار دیتی ہے۔ عباسی دور کے بعد مملکتِ اسلامیہ مختلف ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ سلجوقی، غزنوی، غوری، فاطمی، مغل ملوک

حاشیہ بقیہ پچھلا صفحہ سے

کا ثبوت ملتا ہے۔

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں عراق کی مفتوحہ زمینوں کی تحویل کے بارے میں صحابہ کرام اور عامۃ المسلمین سے مشورہ کیا۔ بیت المقدس کا سفر کرنے کے بارے میں صحابہ کرام سے مشورہ کیا۔

بقیہ دیگر خلفاء راشدین حضرت عثمان اور حضرت علی رضوان علیہما کے عہد میں بھی ایسے شورائی فیصلوں کا ثبوت ملتا ہے (ملاحظہ ہو اسلام کا نظام حکومت ص ۳۰۰ تا ۳۱۱)

۱۳۔ امتِ مسلمہ کو یزید کی نامزدگی پر اعتراض ضرور ہوا اور وہ بھی شاید اس لئے کہ اس کے مقابلے میں جناب حسین رض جیسی ہستی تھی ورنہ بعد میں اقتدار کے امیدواروں یا گروہوں میں جنگوں یا مناقشوں کے ماسوا کبھی کوئی خاص مُؤثر احتجاج نہیں ہوا۔

۱۴۔ عدمِ تعاون حکومت میں کوئی عہدہ قبول کرنے سے انکار کی صورت میں اور وہ بھی بعض درویش منش اور اقتدار و جاہ سے زیادہ نفور رکھنے والے فقہاء کرام کی طرف سے مثلاً امام ابو حنیفہ نے خلیفہ منصور کی طرف سے قاضی القضاۃ کے عہدہ کی پیش کش کو ٹھکرا دیا تھا۔ (ملاحظہ ہو حیات نعمان از شبلی نعمانی ص ۸۰، ۹۳)

(بقیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

عثمانی وغیرہ کسی بھی خاندان کی ملوکیت کے خلاف کبھی کوئی اجتماعی کارروائی ہوئی نہ ہی کوئی فتویٰ دیا گیا۔

حتیٰ کہ عصر حاضر کے دوران یزید بن معاویہؓ کی نامزدگی کو منہاج سنت سے انحراف بلکہ مکروہ اور مذموم بدعت قرار دیا گیا۔[۱۵] حقیقت تو یہ ہے کہ اب بھی امت مسلمہ کے کسی اجتماعی فیصلہ کے تحت کسی بھی شاہی حکومت کو غیر اسلامی نہیں قرار دیا گیا۔[۱۶] نہ ہی کبھی ایسی ملوکیت کے خلاف اس ملک کے عوام نے کوئی تحریک چلائی نہ ہی عالم اسلام کے کسی فورم سے ایسی کوئی آواز بلند ہوئی ماسوائے اس کے کہ بعض ممالک میں فوجی انقلابوں کے ذریعے رفتہ رفتہ ملوکیتی نظام کی بساط لپیٹی جا رہی ہے اور یہ کہ ایران کے شہنشاہ کے خلاف تحریک کے روحانی قائد جناب آیت اللہ خمینی کی طرف سے یہ اعلان

حاشیہ بقیہ پچھلا صفحہ سے

امام ابوحنیفہ عہد و حیات از ابوزہرہ اردو ترجمہ رئیس احمد جعفری مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز لاہور

"نیز امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی" از مناظر احسن گیلانی صفحہ ۱۱۴ ؛ "اگر کوئی شخص بغیر مشورہ امام بن جائے تو کیا اس کی اطاعت فرض ہوگی" اس مسئلہ پر جمہور کا خیال ہے کہ اگر پہلے سے مسلمانوں کا کوئی امام نہ ہو اور کوئی ان کے نظام حکومت پر غالب آجائے تو وہ امام تسلیم کر لیا جائے گا بشرطیکہ اس میں امانت کے اوصاف ہوں اور لوگوں کے درمیان عدل قائم کرے اور لوگ بھی اس سے راضی ہوں اور اس کی بیعت کر لیں۔"

امام مالک کے نزدیک بیعت سے پہلے آزادانہ انتخاب کوئی شرط نہیں بلکہ وہ بیعت کو شرط تسلیم نہیں کرتے ان کے خیال میں لوگوں کی رضامندی اور اقامت حق خلافت کے لئے کافی ہے۔"

امام شافعی کا بھی خیال تھا وہ رضائے لاحق کو کافی سمجھتے تھے۔ ان سے ان کے شاگرد حرملہ نے روایت کی ہے کہ ہر قریشی جو خلافت پر تلوار کے زور سے غالب آجائے اور اسے لوگوں کی تائید حاصل ہو جائے وہ قانوناً خلیفہ ہے۔ چنانچہ شوافع کے نزدیک قرشیت عدالت اور رضائے عامہ ہی کو خلافت میں اصل اہمیت حاصل ہے۔ خواہ رضا بیعت سے پہلے ہو یا بعد میں۔

امام احمد کہتے ہیں کہ جسے خلیفہ بنایا گیا اور لوگ اس پر متفق اور راضی ہوگئے وہ خلیفہ ہے، اور

باقی اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمایئے

کیا گیا کہ اسلام میں ملوکیت کا کوئی جواز نہیں اس طرح حالات زمانہ کے تحت جمہوری تحریک یا سوشلزم وغیرہ کے فروغ سے بعض ممالک کے عوام نے بھی بادشاہتوں کے خاتمہ کے لئے آوازیں اٹھانی شروع کر دی ہیں یا حکومتوں کے تختے اُلٹنے کے اسباب پیدا کئے ہیں۔ لیکن کسی مذہبی ادارہ یا پلیٹ فارم کی طرف سے اس سلسلے میں قطعاً کوئی آواز نہیں اٹھائی جا رہی۔

اصل بات یہ ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد عالم اسلام میں اب تک ملوکیت کے خلاف اگر کبھی آواز اٹھی تو اس کی وجہ زیادہ تر برسر اقتدار افراد کے ذاتی اعمال و کردار کے ناپسندیدہ ہونا تھی اگر کوئی نیک اور رعایا کا خیر خواہ حکمران پیدا ہو گیا خواہ ملوکیتی نظام کے تحت برسر اقتدار آیا ہو اس نے زبردستی یا غاصبانہ طور پر اقتدار حاصل کیا ہو اس کو بھی امت نے سلطان العادل فی الارض ظل اللہ کے خطاب سے نوازا گیا چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ اسلام میں خاندان بنو امیہ کو جہاں ایک طرف

حاشیہ بقیہ پچھلا صفحہ سے

جو ان پر تلوار کے زور سے غالب ہو گیا اور خلیفہ بن بیٹھا وہ بھی خلیفہ ہے۔

امام احمد کا یہ بھی قول ہے کہ جو مسلمانوں کے امام کے خلاف بغاوت کرے درآنحالیکہ لوگ اس پر متفق ہو چکے ہوں اور اس کی خلافت تسلیم کر چکے ہوں خواہ خوشی کے ساتھ یا بالجبر تو اس باغی نے جماعت کا شیرازہ منتشر کیا۔ اور ارشاد نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مخالفت کی۔ اگر باغی اس حال میں مر جائے تو وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔ چنانچہ جمہور فقہاء کا خیال ہے کہ متغلب کی خلافت نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔ اگر امامت کی دوسری شرطیں ان میں پوری ہوتی ہوں اور ان شرطوں میں سب سے اہم عدالت ہے "خلافت کے مسئلے میں جمہور کا مسلک" از استاذ ابو زہرہ (ملاحظہ ہو ترجمان القرآن جلد ۶۰ صفحہ ۱۶۲ - ۱۹۶۳ء شمارہ اپریل)

امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں بالحق (DEJURE) امام اگر میسر نہ ہو تو بالفعل (DEFACTO) جو بھی مسلمانوں کا امام ہو اس کے ماتحت مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا نظام چلتا رہے گا۔ خواہ بجائے خود اس امام کی امامت جائز نہ ہو۔ (ملاحظہ ہو ترجمان القرآن جلد ۶۰ شمارہ ۵ صفحہ ۸۴ - ۲۸۳ - شمارہ اپریل

(بقیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

ملوکیت ایسے ظالمانہ اور آمرانہ نظام کی بنیاد ڈالنے پہ برا بھلا کہا جاتا ہے اس نظام کے تحت حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دور کو خلافت راشدہ کا دور بھی شمار کیا جاتا ہے۔

سطور بالا میں کی جانے والی بحث کا لب لباب یہ ہے کہ اسلام میں طرز حکومت اور حکمرانوں کے چناؤ کا مسئلہ اجتہادی ہے۔ جو ہر عہد اور زمانہ کے لوگوں کی صوابدید پہ چھوڑ دیا گیا ہے۔ کہ وہ جس طرح چاہیں اپنے اولی الامر کا چناؤ کریں۔ بلکہ شاید یہ کہنا بھی ناموزوں نہ ہوگا کہ خواہ کوئی حکمران کسی طریقے سے بھی برسراقتدار آیا یعنی بزور شمشیر، ملوکیت کے تحت، لوگوں کی اکثریت کی تائید سے انقلاب کے ذریعے یا کسی دیگر طریقے سے۔ اگر اس نے برسراقتدار آنے کے بعد ملت مسلمہ، انسانیت اپنے عوام اور اسلام کی بہتری کے لئے کام کیا تو امت کے علماء اور اہل دانش

حاشیہ بقیہ پچھلا صفحہ سے

۱۹۶۳ء مسئلۂ خلافت میں ابوحنیفہ کا مسلک از استاذ ابوزہرہ)۔

اگرچہ خوارج کے خلفائے وقت کے خلاف خروج کے واقعات ملتے ہیں لیکن وہ امت مسلمہ کا بہت ہی محدود گروہ تھے اس لئے ان کی بغاوت کو مجموعی طور پہ مسلمانوں کے نظام حکومت کے خلاف بغاوت متصور نہیں کیا جا سکتا حقیقت تو یہ ہے ان کا اختلاف زیادہ تر خلیفۂ وقت کے عقائد سے ہوتا تھا۔ (راقم)

۱۵۔ ملاحظہ ہو خلافت و ملوکیت از مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم۔ تحریک تجدید و احیائے دین میں تو مولانا مرحوم نے حضرت امیر معاویہ سمیت دور اموی کو "جاہلی حکومت" سے تعبیر کیا۔ بلکہ مزے کی اصل بات تو یہ ہے کہ چودھویں صدی کے آخری ربع میں سعودی ملوکیت کی ان کو خود سرپرستی حاصل رہی غالباً ان کے نزدیک حضرت امیر معاویہ کی حکومت اس وقت کی سعودی حکومت سے بھی گئی گزری ہے۔ نہ جانے مولانا مرحوم نے سعودی ملوکیت کی طرف سے اسلامی خدمات کے صلہ میں شاہ فیصل ایوارڈ اور چھ لاکھ روپیہ کا انعام وصول کرتے وقت حضرت عثمان اور حضرت امیر معاویہ رضوان اللہ علیہما کی طرف سے مسلمانوں کے بیت المال کو بلا دریغ استعمال کرنے کے جرم کو معاف کیا یا نہیں۔ (راقم)

۱۶۔ کس قدر ستم ظریفی ہے کہ دنیائے عرب کی بہت سی ایسی حکومتوں کی طرف سے مولانا مرحوم کو تاحیات سرپرستی حاصل رہی ہے جو خود ملوکانہ طرز کی ہیں۔

نے اس حکمران کی اطاعت ضروری قرار دی اور اس کے خلاف بغاوت کو ناجائز قرار دیا۔[17]

طرز حکومت اور حکمرانوں کے چناؤ کا مسئلہ اجتہادی نوعیت کا ہے تو اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس کو طے کرنے کا مجاز کونسا طبقہ ہونا چاہیے۔

اس وقت مسلمانوں کا ایک طبقہ اس بات کا قائل ہے کہ حکمرانوں کا چناؤ خلافت کی طرز پر ہونا چاہیے اور چناؤ کے سلسلے میں رائے دہی (ووٹ) کا حق ہر کس وناکس کو نہیں ہونا چاہیے جیسا کہ مغربی طرز جمہوریت میں ہوتا ہے بلکہ صرف ان لوگوں کو اس کا حق حاصل ہونا چاہیے جو صاحب علم وتقویٰ ہوں یا کسی خاص معیار تک تعلیم یافتہ ہوں یا بعض دینی فرائض کی پابندی کرتے ہوں۔ ان کے نزدیک ایک اَن پڑھ، جاہل شخص اور اعلیٰ تعلیم یافتہ مثلاً یونیورسٹی پروفیسر، ڈاکٹر انجینئر، عالم دین، قانون دان یا جج کی رائے اسی طرح ایک پڑھے لکھے نوجوان اور ایک پڑھے لکھے کہن سال تجربہ کار جہاندیدہ بزرگ کی رائے کی اصابت ایک جیسی نہیں ہو سکتی۔[18]

دوسرے طبقہ کا خیال ہے اس وقت دنیا اتنی ترقی کر چکی ہے کہ عام زندگی کے مسائل اور حکمرانوں کے چناؤ کا مسئلہ اتنا دقیق یا مشکل نہیں رہ گیا جس کے لئے کسی خاص معیار کی تعلیم یا استعداد کا ہونا لازمی ہو اس وقت سلطانیٔ جمہور کا زمانہ ہے، دنیا بھر میں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر حکمرانوں کا چناؤ ایک تجربہ شدہ چیز ہو گئی ہے۔ اس وقت دنیا کے تقریباً تمام ممالک میں ایک بالغ شخص کو اپنے جملہ معاملات کے بارے میں مجاز اور بااختیار متصور کیا جاتا ہے، بیاہ شادی کاروبار معاہدات الغرض ہر حیطۂ کار میں اگر ایک عام، بالغ اور صحیح الدماغ شخص کی رائے کی بنا پر مشاغل چل رہے ہیں۔ ایسے اشخاص کے حکمرانوں کے چناؤ کے بارے میں فیصلے کیونکر ناقابل اعتماد ہو سکتے ہیں۔

۱۷۔ تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں کے حکمرانوں میں کئی فرمانروا نہایت خونریزی بلکہ دھوکہ دہی کے ذریعے برسر اقتدار آئے اقتدار پر فائز ہونے کے بعد انہوں نے دین اسلام اور لوگوں کی بھلائی کی پالیسی اپنائی تو اس کو دینی حلقوں کی طرف سے پاسبان عقیدہ تک کہا گیا۔ مثلاً شاہجہان اپنے بھائی شہریار کو قتل کر کے برسر اقتدار آیا اور اورنگزیب اپنے دو بھائیوں دارا شکوہ اور مراد بخش کی نعشوں پر سریر آرا ہوئے۔

۱۸۔ گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانی نمی آید (علامہ اقبال)

راقم الحروف کے نزدیک مسلمانوں کے حکمرانوں کے چناؤ اور طرزِ حکومت کے بارے میں عوام کی اکثریت کی رائے کو ہی قابلِ اعتماد ہونا چاہیئے۔ اور بالغ رائے دہی کی بنیاد اور مغربی جمہوریت کی طرز پہ مسلمانوں کی اکثریت کی رائے کے مطابق اس کا فیصلہ خلافِ اسلام نہیں بنتا۔ اس کے لیے بندہ کے دلائل درج ذیل ہیں

۱۔ جمہور عربی لفظ ہے جس کا معنی اکثریت ہے، جمہوریت وہ طرزِ حکومت ہے جس میں حکمرانوں کے چناؤ اور حکمرانی کے بارے میں اہم فیصلے کسی علاقے کے جمہور عوام کی منشاء کے مطابق طے ہوتے ہیں امریکہ کے ایک سابق صدر ابراہیم لنکن نے جمہوری حکومت کی جو تعریف کی ہے کہ

"عوام کی حکومت، عوام کی بھلائی کے لیے اور عوام میں لوگوں کی رائے کے مطابق" کے اصول کا اسلام سے تصادم نہیں ہوتا۔

۲۔ حضرت ابوبکر اور علی رضی اللہ عنہما کے چناؤ کے وقت اس بات کی قطعاً کوئی شہادت نہیں ملتی کہ آیا سقیفہ بنی سعدہ کا داخلہ صرف محدود اہل الرائے کے لیے کھلا تھا اور عوام الناس کو اس میں جانے سے روکا گیا تھا۔

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کبھی صحابہ کرام سے کسی مسئلہ پہ مشورہ طلب فرمایا تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس وقت کسی خاص قسم کا اجتماع منعقد نہیں کیا۔ جس میں صرف محدود اہل الرائے کو اظہارِ رائے کرنے کی اجازت دی گئی اور عوام الناس کو اس کے بارے میں رائے دہی سے روکا گیا۔ حقیقتاً صورتِ حال یہ ہے کہ آپ نے کبھی کوئی شوریٰ کا اجلاس بلایا ہی نہیں بلکہ جب کبھی کوئی مسئلہ اٹھا تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس وقت بلا امتیاز اعلیٰ و ادنیٰ، امیر و غریب، اقرب و ابعد سب صحابہ کرام کے سامنے اسے پیش کیا۔ مثلاً جنگ بدر کے قیدیوں سے سلوک کا مسئلہ ہو یا خندق کھودنے کا مسئلہ تمام موجود حضرات کو اظہارِ خیال کا حق حاصل تھا اور صحابہ کرام کی اکثریت نے جو فیصلہ کیا اس پہ عمل کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میری امت کبھی کسی گمراہی پہ مجتمع (الخیال) نہیں ہوگی۔"[19] اسی طرح ایک دوسرے مقام پہ فرمایا کہ جس چیز کو

۱۹- لا تجتمع امتی علی الضلالۃ او قال ان اللہ لا یجمع امتی (امۃ محمد) علی ضلالۃ ویداللہ علی الجماعۃ۔ (مشکوٰۃ باب الاعتصام۔ حدیث نمبر ص ۱۶۳)

مسلمانوں کی اکثریت اچھا خیال کرے وہ چیز احسن ہے۔[۲۰]

۴۔ ایک اور مقام پر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا سوادِ اعظم کے ساتھ رہنا لازم پکڑو۔[۲۱]

۵۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے جو شخص سیدھا راستہ ظاہر ہونے کے بعد اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مخالفت کرتے ہوئے ایسی راہ اختیار کرے گا جو مسلمانوں کی نہیں تو ہم اسے متوجہ رکھیں گے اس طرف جس طرف وہ متوجہ ہوا ہے اور داخل کریں گے اسے جہنم میں جو بہت برا ٹھکانہ ہے۔[۲۲] آیت کریمہ مذکورہ میں مسلمانوں کا راستہ کہہ کر اللہ تعالیٰ نے بات بالکل صاف کر دی ہے ظاہر ہے مسلمانوں کا راستہ وہی ہو سکتا ہے جس پر مسلمانوں کی اکثریت چل رہی ہو نہ کہ چند افراد اس پر چل رہے ہوں۔

۶۔ اسلام نے احکام کے سلسلے میں عرف کو بہت اہمیت دی ہے یعنی عرب کے وہ تمام رسوم و رواج جو حکمت الٰہی کے (منفعت عوام اور دفع مضرت و تنگی اور حرج) موافق تھے۔ وہ سب قبول کر لیے گئے۔ حتیٰ کہ غیر عرب علاقوں کے عرف کو بھی مسترد نہ کیا خواہ وہ کسی ملت، مذہب یا قوم سے متعلق رہے ہوں۔

۲۰۔ ما راٰہ المسلمون حسنا فھو عند اللہ حسن و ما راٰہ المسلمون قبیحا فھو عند اللہ قبیح
بعض محدثین کے نزدیک یہ حدیث ہے جیسا کہ آمدی نے "الاحکام" جلد ا صفحہ ۱۱۲ میں کہا ہے لیکن بعض کے نزدیک یہ حضرت عبداللہ بن مسعود کا قول ہے۔ ملاحظہ ہو مقاصد حسنہ لسخاوی کتاب السنہ جلد ا شرح حموی علی الاشباہ جلد ا صفحہ ۱۲۷ اور شرح المجامع صفحہ ۳۰۸۔ بحوالہ فلسفہ شریعت اسلامیہ ۱۷۹

۲۱۔ اتبعوا سواد الاعظم فانہ من شذ شذ فی النار (مشکوٰۃ شریف جلد ا باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ ص۵۲)۔

اس ضمن میں خلیفہ وقت کی طرف سے علمائے وقت کی موجودگی میں اپنے بیٹوں کی جانشینی کے جواز کی دلیل میں اپنی مشہور تصنیف "احکام السلطانیہ" میں جناب ماوردی لکھتے ہیں کہ سلیمان بن عبدالملک نے عمر بن عبدالعزیز کو ان کے بعد یزید بن عبدالملک کو اپنا ولی عہد مقرر کیا اگر مسلمانوں کے پاس ایسا کرنے

(بقیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمایئے)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ عرف ہے کیا چیز؟ فقہائے کرام نے عرف کی یہ تعریف کی ہے کہ ایسا فعل یا عمل جس کو کسی علاقے کی اکثریت مستحسن قرار دیتی ہو۔(۲۳) عرف کو کسی قوم کا تعامل یا عادت بھی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے (اے پیغمبر) عفو و درگذر سے کام لیجئے، عرف کا حکم دیجئے اور جاہلوں سے نہ الجھئے۔(۲۴) اسی طرح عرف کے بارے میں فقہ کا اصول ہے کہ جو چیز عرف سے ثابت ہے وہ نص سے ثابت کے مثل ہے۔(۲۵)

فقہائے کرام نے مفتیان حضرات کے لئے یہ اصول طے کر دیئے گئے ہیں کہ وہ پیش آمدہ مسائل کے سلسلے میں عرف زمانہ کا لحاظ رکھیں خواہ وہ متقدمین کے مؤقف کے خلاف ہی ہو۔(۲۶) حتیٰ کہ عرف کے خلاف فتویٰ ناجائز قرار دیا گیا ہے۔(۲۷) اور عرف عام کا فیصلہ نص کے فیصلہ کے مانند قرار دیا گیا ہے۔(۲۸) اور لوگوں کے دستور کو حجت قرار دے کر اسے واجب العمل قرار دیا

حاشیہ بقیہ پچھلا صفحہ سے

کی دلیل نہ بھی ہوتی تو بھی اس کے ایسے معاصر علمائے تابعین کا جو دین کے معاملہ میں کسی ملامت کو خاطر میں نہیں لاتے اس کو منظور کر لینا ہی اس کے جواز کی دلیل ہوتا۔ ہارون الرشید نے اپنے زمانے کے علمائے امت سے مشورہ کرکے اپنے تینوں بیٹوں امین، مامون اور مؤتمن کو ترتیب وار ولی عہد بنایا۔ (صفحہ ۱۲۷ اردو ترجمہ)

۲۲- ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین له الهدیٰ ویتبع غیر سبیل المؤمنین نوله ما تولی ونصله جهنم وساءت مصیرا (سورہ نساء آیت ۱۱۶)

۲۳- عادة جمهور قوم فی عمل او قول (المستصفیٰ - غزالی)

۲۴- (الف) التعامل وهو عادة الناس فی المعاملات البیع والشراء وغیرهما۔

(ب) وعادة عبارة عما یستقر فی النفوس من الامور المتكررة المقبولة عند الطباع السلیمة (الاشباه والنظائر)

۲۵- خذ العفو وأمر بالعرف واعرض عن الجاهلین (سورہ اعراف آیت ۱۹۹)

۲۶- الثابت بالعرف کالثابت بالنص الثابت بالعرف کثابت بدلیل شرعی (شرح زرقانی جلد ۱ ص ۱۱۵)۔

(بقیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمایئے)

گیا ہے۔[۳۰] اسلام نے جس عرف وعادت زمانہ کو اس قدر زیادہ اہمیت دی ہے۔ وہ عرف وعادت وہی فعل یا عمل ہو سکتا ہے جس پر عوام الناس کی اکثریت عامل ہو۔ محض کسی مخصوص طبقہ یا اہل الرائے کی پسند کو عادۃ الناس قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ظاہر ہے اس کے لئے عوام الناس کی اکثریت کی رائے اور پسند ہی اس کا مدار اور معیار قرار پائے گی۔

مندرجہ بالا دلائل سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے کہ "سبیل المؤمنین" وہی طریقہ ہو سکتا ہے جس پر فرزندان توحید کی اکثریت رواں دواں ہو، حدیث کی رو سے صرف اس راستہ کو "عصمت امۃ" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور صرف اس فعل کو معروف کہا جا سکتا ہے جس کی اتباع اسلامیان کی اکثریت کر رہی ہو کوئی ایک گروہ یا چند اشخاص خواہ کس قدر اہل علم وبصیرت اور زہد وتقویٰ ہوں۔ ان کی رائے کو عصمت عن الخطاء حاصل نہیں ہو سکتی اسی طرح کوئی علمی مسئلہ ہو یا دنیاوی معاملہ اس کے بارے میں کسی رائے کو صرف اس وقت عرف وعادہ کا درجہ حاصل ہوتا ہے جب ملت مسلمہ کی اکثریت اس کو احسن گردانتی ہو۔ پھر ارباب اقتدار کے چناؤ کے لئے کسی اقلیتی رائے کو کیونکر صائب قرار دیا جا سکتا ہے لہٰذا جو لوگ اکثریت عوام کو چھوڑ کر محض تعلیم یافتہ افراد کو ووٹ کا حق دینا چاہتے ہیں انہوں نے دین کی منشا کو سمجھا ہی نہیں پیغمبر علیہ السلام نے جب خود صاحب وحی ہونے کے باوجود غیر منصوص احکام میں اپنی رائے کو امت کے مشورہ اور سبیل المؤمنین سے ہم آہنگ رکھا تو پھر کسی بھی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ سبیل المومنین کے برعکس صرف محدود افراد کی رائے کا تابع بنانے کی وکالت کرے۔

حاشیہ بقیہ پچھلا صفحہ سے

۲۷۔ ان یفتی علی عرف اہل زمانہ وان خالف زمان المتقدمین (ردالمختار)

۲۸۔ انما تعتبر العادہ اذا اضطرادت او غلبت (الاشباہ والنظائر صفحہ ۶۵)

۲۹۔ ملاحظہ ہو مجلۃ الاحکام العدلیہ (دفعہ ۴۵)۔

بعض لوگ موجودہ جمہوری طرزِ حکومت کے ووٹنگ سسٹم کے بارے میں یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس میں عالم جاہل، زاہد، عاصی، متقی، فاسق کی رائے ہم پلہ قرار پاتی ہے۔ حالانکہ اسلام نے تقویٰ کو تمامتر تفضیلتوں اور تکریمات کا معیار قرار دیا ہے۔ جبکہ مغربی طرزِ جمہوریت میں نمائندوں کی اہلیتوں کے سلسلے میں کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ نہ ہی کوئی اس بات کا لحاظ رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں اصل صورت حال یہ ہے کہ اولاً تقویٰ کی پرکھ اللہ کے سوا کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ اسی لئے اللہ تعالےٰ نے فرمایا اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ صاحب تکریم وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔ ثانیاً اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ تقویٰ کی جانچ پڑتال انسان بھی کر سکتے ہیں تو پھر مسئلہ یہ پیدا ہوگا کہ ہر شخص کا معیارِ تقویٰ اپنا اپنا ہوتا ہے۔ عین ممکن ہے کسی ایک مکتب فکر کے نزدیک کوئی شخص بہت متقی ہو جبکہ وہی شخص دوسرے مکتب فکر کے ماننے والوں کے نزدیک سب سے زیادہ برا، قابل نفرت بلکہ گردن زدنی ہو۔ بعینہٖ علمیّت کی بھی یہی حالت ہوگی یعنی علم کی جانچ کے لئے کسی کا کوئی معیار ہوگا اور کسی کا کچھ لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ جس کو زیادہ لوگ اچھا سمجھیں وہی اچھا ہوگا۔[۲۹] اور جس کو زیادہ لوگ عالم قرار دیں وہی اعلم قرار پائے گا۔ یہی دلیل نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حدیث سے ثابت ہوتی ہے۔[۳۰] ظاہر ہے ایسی صورت میں مسلمانوں کی اکثریتی رائے عوام الناس کی رائے ہی ہو سکتی ہے۔ خواص کی رائے نہیں ہو سکتی ورنہ پھر اس کی وضاحت ہو جاتی جیساکہ قرآن مجید میں کئی مقام پر آیا ہے کہ تم سے پیشتر جو نبی آیا۔ وہ مرد ہی تھا اگر تم نہیں جانتے تو اس بات کی تصدیق اہل الذکر سے کر لو۔[۳۱] ایسے

۲۹۔ ملاحظہ ہو مجلتہ الاحکام العدلیہ (دفعہ ۴۵)

۳۰۔ استعمال الناس حجۃ یجب العمل علیھا (ایضاً دفعہ ۳۷) یہاں پر یہ بھی ملحوظ رہے کہ عرف اور عادت کی اہمیت کے پیش نظر علمائے کرام نے اس پر کافی طویل بحثیں کی ہیں اور ابن عابدین مشہور حنفی فقیہ نے نشر العرف کے عنوان سے ایک رسالہ بھی تصنیف کیا۔

۳۱۔ متذکرہ بالا حدیث کی رو سے ما راٰہ المسلمون حسنا فھو حسن۔

معاملات میں اہل الذکر کی طرف رجوع کرنے کا اس لئے کہا گیا کیونکہ یہ علمی باتیں ہیں ان کے بارے میں اہل علم و ذکر ہی بتلا سکتے ہیں۔

امور سلطنت چلانے کے سلسلے میں علمائے دین نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ ہر شعبہ حکومت میں اس شخص کو مقدم رکھا جائے گا جو اپنے عہدہ کے فرائض منصبی انجام دینے کی صلاحیت و استعداد رکھتا ہو۔ مثلاً عام حکمرانوں میں اس آدمی کو ترجیح دی جاتے جو قوم کی سیاست و شریعت کے احکام سے زیادہ واقف ہو۔ جس میں ہنر شناسی ہو تاکہ وہ ہر شعبہ میں ماہرین فن کا تقرر کر سکے۔ اسی طرح امور جنگ و دفاع ایسے شخص کو تفویض کئے جائیں جو عسکری امور کا ماہر ہو۔ دشمنوں کی جنگی چالوں کو سمجھنے اور ان کے توڑ کی صلاحیت رکھتا ہو۔ عدلیہ میں ایسے افراد مقرر کئے جانے چاہئیں جو احکام شریعت، فقہ اور استنباط مسائل کے زیادہ اہل ہوں۔ الغرض ہر حیطہ کار میں باصلاحیت افراد کے تقرر میں محض تقویٰ کو معیار قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ تقویٰ کے ساتھ ہر متعلقہ شعبہ یا فن کا جاننا بھی ضروری ہو گا۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں محض تقویٰ اور نیکی کو امور مملکت چلانے کے لئے لازمی شرائط قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ ان کے ساتھ حالات زمانہ، دنیوی امور، علم شریعت اور دیگر امور کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہو گا۔ اور ایسے اختیارات کی تفویض کے لئے امت کی اکثریت (سبیل المومنین) کا تعین مشاورت سے ہو سکتا ہے۔ مشاورت کے لئے علمائے دین نے مندرجہ ذیل اہم عناصر کا تعین کیا ہے[۳۴]

۱۔ امام شوروی حکومت کا منتخب رہنما ہونا چاہئے۔

۲۔ امت خدائے واحد کو ماننے والوں اور اس کے فطری قوانین پر گامزن ہونے والے انسانوں کا

حاشیہ بقیہ پچھلا صفحہ سے

۳۲۔ ملاحظہ ہو حدیث حوالہ بالا نمبر (ما راہ المسلمون حسنا فھو حسن

۳۳۔ وما ارسلنا قبلک الا رجالا نوحی الیھم فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون (سورہ انبیاء آیت ۷)

۳۴۔ ملاحظہ ہو اسلام کا نظام حکومت از حامد الغازی الانصاری ص ۶-۲۰۵

عالمگیر گروہ اور شیرازہ بند شوروی نظام۔

۳۔ مجلس اہل حل و عقد حکومت کے مدیروں اور مشیروں کا مرکزی ادارہ جس کے ارکان اپنے اعلیٰ کردار اور بلند خدمات کی وجہ سے پوری طرح امت کے اعتماد کا مرکز ہوں۔

۴۔ ارکان شوریٰ۔ اسلامی ریاست عامہ کے وہ تمام شہری جو اسلام کے فطری قوانین کے پابند ہوں بشرطیکہ اوسط علم و عقل سے بہرہ مند ہوں۔ امت کے تمام افراد جو شوریٰ میں شرکت کر سکیں جو اجتماعی نظم کے بھی خواہ ہوں ذاتی غرض اور شخصی نفع اندوزی کے تصور سے خالی ہوں یعنی امین ہوں اور اس درجہ سلامتی فکر کے مالک ہوں کہ صحیح رائے پیش کر سکیں۔ اشتراک کا طریقہ حالات کے مطابق بدل سکتا ہے۔

۵۔ رائے دہندگان۔ ہر وہ انسان جو اسلام کے معاشرۂ اخوت کا رکن ہو، عاقل بالغ اور پابند قانون ہو، کسی معاملے پر رائے دینے کے لئے جتنا علم اور سمجھ بوجھ ضروری ہے اس سے محروم نہ ہو۔

استصواب رائے عامہ کی صورت میں حق رائے دہی کی دو شرطیں ہیں۔

اسلام اور اسلامی شعور اس کے علاوہ نہ کسی علمی ڈگری کی ضرورت ہے نہ ثروت مندی نہ کسی خاص قیمت کی جائیداد کے مالک ہونے کی نہ رنگ و نسل کی نہ قوم و وطن کی۔

اس صورت میں عورتوں، مردوں، بوڑھوں، بچوں، شہریوں، دیہاتیوں و مسافر و مقیم سب حق رائے دہی کے مالک ہیں۔

اگر جمہوریت نہیں تو پھر کونسا نظام

بالغ رائے دہی کی بنیاد پر اکثریتی رائے کے مطابق چلنے والے نظام حکومت جمہوریت کو اگر فی الحال مسترد بھی کر دیا جائے تو پھر سوال پیدا ہوگا کہ اس کی جگہ پر کونسا نظام نافذ کیا جائے۔ اس وقت وحی کا سلسلہ تو ختم نبوت کی وجہ سے منقطع ہے ورنہ وحی کے ذریعے ہی حتمی طور پر طے کر لیا جاتا کہ تاکہ فلاں حضرات کو اللہ تعالےٰ نے خلیفہ نامزد فرمایا ہے یا فلاں فلاں قائد کی رہنمائی میں ملت اسلامیہ کی فلاح ہو سکے گی۔ لہٰذا اس کو زمام حکومت تفویض کر دو۔ ایسے قطعی ذریعے کے بعد دنیا میں

حصول اقتدار کے جو طریقے ہیں وہ بادشاہت (جو کہ موروثی ہوتی ہے اور وہ بھی رفتہ رفتہ ختم ہو رہی ہے قطع نظر اس کے کہ اس نظام کے مفاسد ویسے بھی اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی) بذریعہ طاقت یا انقلاب اقتدار پر قبضہ کرنا ہے یا اشتراکی نظام ہے جس میں ایک ہی برسر اقتدار گروہ کا طاقتور شخص یا گروہ برسر اقتدار آسکتا ہے۔ یا موجودہ (مغربی) جمہوری نظام ہے۔ اب کیا کوئی دانا و بینا شخص یہ بتا سکتا ہے کہ اس وقت دنیا میں کونسی حکومت عوام و ملک کی فلاح، سکون اور تسلسل کے ساتھ انجام دے رہی ہے۔ مغربی جمہوری حکومتیں یا غیر ترقی یافتہ مسلمان ملکوں کی حکومتیں۔ فلاحی معاشرے کہاں قائم ہیں، کہاں پر حکمرانوں کی تبدیلیاں پرامن طور پر ہوتی ہیں۔ کہاں پر خون آدم کی ارزانی ہے انسانی حقوق پائمال ہوتے ہیں اگر تعصب کی عینک اتار کر معروضی اور منصفانہ طور پر دیکھا جائے تو لامحالہ طور پر نتیجہ یہ سامنے آئے گا کہ انہیں ممالک میں پرامن تبدیلیاں ہوتی ہیں جہاں پر بالغ رائے دہی کے ذریعے حکمرانوں کا چناؤ ہوتا ہے جہاں پر یہ نظام باقاعدہ طور پر تواتر سے زیر عمل نہیں وہاں پر یہ کیفیت ہے کہ جو ایک دفعہ اقتدار پر قابض ہو گیا پھر اس کو ہٹانے کے لئے تو خون خرابہ یا انقلاب سے ہی کام لیا گیا ورنہ سالہا سال تک ایک شخص کرسی اقتدار سے چمٹا رہتا ہے اور جب تک عوام اس کے خلاف اٹھ کر کتا اور نہ جانے کیا کیا نہیں بنا ڈالتے وہ جانے کا نام تک نہیں لیتا اور پھر اس کو ہٹانے کے عمل میں بھی سینکڑوں بلکہ بسا اوقات ہزاروں انسان جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں معاشرے میں بے چینی اضطراب اور تحریک کی وجہ سے معاشی نقصان جو ہوتے ہیں وہ اس کے علاوہ ہیں۔ جن ممالک میں پرچی کی بنیاد پر حکومتیں تبدیل ہوتی ہیں۔ وہاں پر شاید ہی کوئی ایسی مثال ملتی ہو جہاں کسی انسان کو جان سے ہاتھ دھونا پڑتا ہو۔ جو لوگ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر تبدیلی اقتدار کی مخالفت کر رہے ہیں شاید ان کی منشا یہ ہے کہ امت مسلمہ میں پرامن تبدیلی اقتدار کا سلسلہ جاری نہ ہو اور نہ ہی امت مسلمہ کو سکون میسر آسکے۔ چونکہ اول تو اس زمانہ میں ایسی کوئی ہستی نہیں ملے گی جو کہ ابوبکرؓ یا عمرؓ کی اتباع میں تن من دھن ملت پر نچھاور کر سکے۔ نہ ہی کسی ایسی ہستی کو اس زمانے میں کوئی چلنے دے گا اس کا مطلب یہ ہوا کہ مسلمانوں کے حکمرانوں کی جو حالت

اس وقت ہے وہی قائم رہے گی۔ اس وقت امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی، جاپان، کنیڈا، آسٹریلیا سویڈن، آسٹریا وغیرہ میں سالہا سال سے یہ نظام چل رہا ہے بلکہ اس نے ثابت کر دیا ہے کہ اس وقت تبدیلیٔ اقتدار کے لئے انسانی فلاح اور بھلائی کے لئے اس سے محفوظ تر اور پرامن کوئی دوسرا نظام نہیں حتیٰ کہ ہندوستان اور اسرائیل ایسے ممالک جن کی عمریں تقریباً پاکستان کے برابر ہیں وہاں پر کبھی کوئی ایسی ابتری نہیں پھیلی جیسی پاکستان میں رہی ہے۔ حالانکہ روز اول سے لے کر اب تک پاکستان میں جو بھی حکمران آیا اسے تو لوگوں نے خلیفہ راشد کے خطابات سے نوازا بلکہ بعض حضرات نے صدر محمد ایوب خان کو حضرت عمر فاروقؓ سے بھی زیادہ عادل اور مدبر قرار دے ڈالا تھا۔ پھر کیوں امت نے چند سال بعد ان کو اتار پھینکنے کے لئے تحریک چلائی کیا بالغ رائے دہی کی مخالفت کرنے والے حضرات یہی چاہتے ہیں کہ اسلامی حکومتوں میں ہمیشہ خون خرابہ ہوتا رہے عوام کو اپنے حکمرانوں کو تبدیل کرنے کے لئے بار بار خون کی ندیوں سے گزرنا پڑتا رہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جو لوگ مسلمانوں کی اکثریت پر اعتماد نہیں کرتے وہ چاہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح یہ ثابت کریں کہ اسلام یا تو اس زمانے میں کامیابی سے زیر عمل نہیں لایا جا سکتا یا چاہتے ہیں کہ یہ ایک متحرک فعال اور آفاقی دین کی طرح ہر زمانے کے تقاضوں کے پیش نظر بنی نوع انسان کی دینی و دنیوی فلاح و بہبود کا مذہب نہ رہے۔ یا پھر مصر، الجزائر، عراق، لیبیا، شام، سوڈان، یمن کی طرح یک جماعتی حکومت رہے۔ اگر یہ نہیں تو پھر بادشاہت کیوں نہ رہ جائے۔ آخر سعودی عرب اردن کی حکومتوں میں کیا قباحت ہے کیا وہاں پر ملت مسلمہ نہیں بستی۔ امام الحرمین وہاں بھی موجود ہیں۔ دنیائے اسلام کے تمام دینی حلقوں کے نزدیک امام الحرمین سب سے زیادہ قابل احترام واجب التعظیم اور اتباع یہ دونوں ہستیاں ہوں گی۔ جب ان کو ملوکیت پر کوئی اعتراض نہیں۔ ان ممالک کے عوام میں بظاہر کوئی بے چینی یا اضطراب نہیں تو پھر ہم کون ہوتے ہیں اعتراض کرنے والے۔ جن مسلمان ممالک کی سطور بالا میں مثال دی گئی ہے وہاں پر یک جماعتی یا غیر جماعتی سیاسی نظام رہا ہے۔ ان کے نقش قدم پر بسم اللہ کر دیجئے تمام جماعتوں کو خلاف قانون قرار دے دیجئے اور جناب

صدر مملکت کو امیر المومنین یا خلیفۃ المسلمین بنا ڈالئے کیا ضرورت ہے ہر چار پانچ سال بعد بحران کو تازہ کرنے کی۔ اللہ کے فضل سے بے شمار اہل الرائے صاحب تقویٰ و بصیرت ایسے مل جائیں گے جن کو جنرل ضیاء الحق کے بطور امیر المومنین تقرر پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

الیکشن سسٹم کے خلاف بعض لوگ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اس میں امیدوار اپنے تئیں پیش کرتے ہیں اور وہ اس دلیل کی تائید میں حدیث پیش کرتے ہیں کہ کسی عہدہ کے لئے آپ کو پیش نہ کیا جائے چونکہ جس شخص نے اپنے لئے کسی عہدہ کی طلب کی اس کو آزمائش میں ڈالا جائے گا جس کو بلا طلب کے کوئی عہدہ ملا اللہ تعالیٰ اس میں اس کی مدد فرماتے ہیں۔(۲۵)

اس حدیث کے جواب میں سب سے پہلی دلیل میں یہ دوں گا کہ پیغمبر علیہ السلام کے زمانے اور وہ بھی نزول وحی کے وقت کسی عہدہ کے لئے اپنے آپ کو پیش کرنا۔ یقیناً پسندیدہ نہیں ہو سکتا۔ اولاً محدود سے معاشرے میں جہاں ہر شخص ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتا ہو کسی باخبر شخص کے لئے کسی کی صلاحیتیں مخفی نہیں رہتیں چہ جائے کہ پیغمبر علیہ السلام ایسی ہستی کی نظر میں(۲۶) جن کی فراست اور بصیرت کے سامنے دنیا جہاں کے اہل نظر حضرات ہیچ ہوتے ہیں اس پر مستزاد یہ کہ وحی الٰہی کے ذریعے پیغمبر علیہ السلام کو پردہ غیب میں مستور معاملات کے بارے میں بھی خدا تعالیٰ آگاہ فرماتے ہیں۔ ثانیاً آپ نہایت بامروت تھے اس لئے ایسی صورت میں کسی شخص کی صلاحیتوں کے پیش نظر آپ کا اس کو مطلوبہ عہدہ نہ دینے سے امکان ہو سکتا

۲۵۔ ملاحظہ ہو باب العمل فی القضاء والخوف منہ، مشکوٰۃ، (حدیث ۲۵۶۲)

۲۶۔ جیسا کہ حدیث ہے کہ مومن کی فراست سے بچو چونکہ نور الٰہی اس کے لئے مشعل راہ ہوتی ہے جبکہ پیغمبر کی بصیرت و فراست کی تو کوئی انتہا نہیں ہو سکتی (اتقوا فراسة المؤمن فانه ينظر بنور الله

تھا کہ اس کے دل میں ملال آتا جو کہ یقیناً اس شخص کی ہلاکت ایمانی اور خسران عاقبت کا باعث ہوتا۔[۲۷] اور یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ آپ کسی نااہل کو محض مروتاً کسی عہدہ پہ فائز کر دیتے چونکہ یہ قرآنی اصول ودلیت امانت میں لحاظ اہلیت کے منافی ہوتا۔[۲۸] ثالثاً عہد نزول وحی کے دوران تفویض عہدہ جات میں وحی الٰہی بھی راہنمائی فرماتی رہی۔[۲۹]

باقی رہا یہ مسئلہ کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد اسلام میں کسی عہدہ کے لئے کسی اہل آدمی کو اپنے آپ کو بطور امیدوار پیش کرنے کی اجازت ہے یا نہیں! اسلام نے یقیناً اس کی مخالفت نہیں کی۔ اس کی سب سے پہلی مثال ثقیفہ بنی سعدہ میں استحقاق خلافت کی تقریر ہے۔ جس میں مہاجرین و انصار، طرفین کی جانب سے اپنے اپنے حق میں دلائل دیئے گئے کیا صحابہ کرامؓ نے آنحضرت کے وصال کے چند گھنٹے بعد ہی اسلام کی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا تھا اور اتنے بڑے اجتماع میں کسی ایک صحابی کو بھی اسلام کے ایک ضروری اور بنیادی حکم کی طرف اپنے ساتھیوں کی توجہ مبذول کرانے کی توفیق نہ ہوئی۔ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ اپنے راہنما اور پیشوا کے اس دنیا سے رخصت ہونے کے چند گھنٹے بعد اس کی تعلیمات سے آنکھیں پھیر لینا کوئی جرم ہی نہیں سمجھا گیا اگر یہ دعویٰ درست تسلیم کر لیا جائے تو پھر یقیناً سقیفہ بنی سعدہ میں موجود تمام حضرات پر یہ الزام صادق آتا ہے حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے چونکہ حقیقتاً بات یہی تھی کہ پیغمبر علیہ السلام کے حضور طلب عہدہ ندیدہ پن تھا۔ اس لئے اس کی ممانعت کر دی گئی تاکہ پیغمبر علیہ السلام

۲۷۔ جیسا کہ روایات میں آتا ہے کہ آپؐ نے کبھی کسی سوئے ہوئے شخص کو نماز کے لئے نہیں جگایا بلکہ آپ ایسے مواقع پر کسی صحابی کے ذریعے سونے والے کو جگانے کا کہتے مبادا کہ نیند کے غصہ میں اس کے منہ سے انکار نہ نکل جائے۔

۲۸۔ ان اللہ یأمرکم ان تؤدوا الامانات الی اھلھا (سورہ نساء آیۃ)

۲۹۔ ملاحظہ ہو سیرت النبیؐ۔ ابن ہشام صفحہ ۴۹۱۔ ج ۱۔ (رسول اللہ نے حضرت صدیق اکبر کو ہجرت مدینہ کی اجازت مانگنے پر فرمایا۔ لا تعجل لعل اللہ یجعل لک صاحباً)

کے لئے عہدیداران کے چناؤ میں مکمل آزادی بھی برقرار رہے اور اس کے ساتھ ہی جن جن حکمتوں کے پیش نظر آپ کو انتخاب فرمانا ہوتا وہ صیغۂ راز میں بھی رہ سکیں۔ اگر اسلام میں کسی عہدے کے لئے پیش کرنا ممنوع ہوتا تو اس زمانے میں جبکہ چھوٹے سے چھوٹے ملک کی آبادی لاکھوں سے کم نہیں ہوتی کیا یہ ممکن تھا کہ کسی عہدے کے لئے امیدواروں کے بغیر کوئی حاکم اپنی معلومات یا بصیرت کے مطابق اس کو چن سکتا اگر ایسا ممکن نہیں ہو سکتا تھا تو کیا اسلام پر یہ الزام نہیں آئے گا کہ یہ ہر وقت زمانے اور ہر قوم کے لئے آفاقیت اور عالمگیریت کا حامل نہیں ہے۔ اور نہ ہی یہ حقیقت پسندانہ ہے جو زمانے کے اٹل تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت رکھتا۔ یہی وجہ تھی کہ اسلام نے ہر جزئیہ کی تصریح کے بجائے اصول بتلا دیئے۔ ان کی روشنی میں اجتہاد سے کام لے کر ہر آنے والے زمانے اور مسئلہ سے عہدہ برآ ہونے کی اجازت دے دی اس سے فکر و تدبر کی راہیں بھی کھلی رہیں اور آزادی رائے بھی برقرار رہی۔ دوسری طرف اس کی عالمگیریت قائم رہنے سے تنگ دامنی اور تنگ ظرفی کے الزام سے بھی یہ محفوظ رہا۔ کیا وجہ ہے کہ ہر زمانے میں اسلام کے ماننے والوں کو کبھی اس قسم کی دشواری کا سامنا نہیں ہوا جیسا کہ دیگر مذاہب والوں کو ہوتا رہا ہے اور ہو رہا ہے ان مذاہب کے ماننے والوں کو گاہے گاہے اپنی دینی تعلیمات میں حسب موقع و محل ترمیمات اور تبدیلیاں کرنے کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ مثلاً عیسائیت میں طلاق (اس صورت میں کہ ازواج میں سے کسی ایک پر بدکاری کا الزام پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے) کسی صورت میں نہیں دی جا سکتی نہ ہی زوجین کی طبائع کی عدم مطابقت کی بناء پر میاں بیوی میں علیحدگی ہو سکتی تھی۔ بعینہٖ ہندوؤں کے ہاں نکاح بیوگان وغیرہ جو کسی وقت بھی جائز نہیں تھا اب حالات کے مجبور کرنے پر ان کے ہاں جواز نکالا جا رہا ہے۔ اسی طرح دیگر مذاہب کی مثالیں ہیں۔ لیکن اسلام کو کبھی کسی قسم کے بحران کا سامنا نہیں ہوا۔ اب رہ گیا یہ مسئلہ کہ جب اسلام نے کوئی نظام مخصوص یا متعین نہیں کیا تو پھر پارلیمانی جمہوریت پر زور کیوں دیا جا رہا ہے؟ اس کا جواب صرف یہ ہے کہ اسلام کی رو سے یہ ثابت کرنے کی کوشش

نہیں کی جا رہی کہ پارلیمانی طرز حکومت ہی واحد اسلام کے قریب نظام حکومت ہے۔ بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے مخصوص حالات کے تحت صدارتی طرز حکومت مطلق العنانیت پر منتج ہوتا ہے یعنی جن ممالک میں خواندگی کی شرح کم ہو۔ غربت و افلاس بھی زیادہ ہو، وہاں برسر اقتدار کسی بھی شخص کے لئے یہ نسبتاً آسان ہوتا ہے کہ اقتدار، حاکمیت، سرکاری ذرائع، مراعات، دھونس یا دولت کے ذریعے آمریت کے جھنڈے گاڑ دے اور آزادی رائے کو دبا دے کسی اختلاف کرنے والے کی آواز کو خاموش کر دے چونکہ لوگوں کو اپنے حقوق کا احساس ہوتا ہے، نہ جہالت، تعلیم کے فقدان سے وہ معاملات سلطنت میں مؤثر دخل نہیں دینے پاتے ان کے نمائندے بھی ظاہر ہے اپنے ووٹروں اور حکمرانوں کی ان کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں اس لئے اگر وہ عوام (اپنے رائے دہندگان سے ووٹ لیتے وقت) کوئی وعدہ بھی کریں تو عدم ایفائے عہد کرانے کے لئے ان کے پاس بے شمار بہانے اور حیلے ہوتے ہیں۔ اس کی بڑی بیّن مثال واٹر گیٹ سکینڈل ہے[۴۰]

۴۰۔ واٹر گیٹ ایک جگہ کا نام ہے جہاں پر ۱۹۷۲ء کے امریکی صدارتی انتخابات کے دوران حاکم وقت (صدر نکسن) کے مدمقابل کے ہیڈ کوارٹر میں صدر کے کارندوں کی طرف سے خفیہ گفتگو سننے کے لئے آلات نصب کر دیئے گئے تھے۔ جب اس حرکت کی کسی جگہ بھنک پڑی اور بات پھیلنے لگی تو صدر کی طرف سے اس واقعہ کو دبانے کا کہا گیا اس پر صدر نکسن پر یہ الزام آیا کہ انہوں نے اس واقعہ پر مٹی ڈالنے کا کہا ہے لہذا دال میں ضرور کالا کالا ہے جس پر کسی صحافی کے سوال پر صدر کی طرف سے اس حرکت سے لاعلمی کا اظہار کیا گیا۔ قوم میں اس کے بارے میں لے دے ہونی شروع ہو گئی۔ "نوبت بہ این جا رسید" کہ صدر کا اظہار لاعلمی جھوٹ تھا۔ امریکہ کے صدر کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ جھوٹ بولے۔ لہذا ایسے شخص کو عہدہ سے ہٹانا ضروری ہو گیا۔ (یہاں پر اس امر کا ذکر بے محل نہ ہو گا کہ خفیہ گفتگو سننے والے آلات نصب کرانے کے ذمہ دار افراد یعنی صدر کے اٹارنی جنرل اور ان کے ساتھیوں کو بعد میں عدالت قانون نے قید کی سزا بھی دی اور ابھی تک وہ سزا بھگت رہے ہیں) صدر کو عہدے سے الگ ہونا پڑا۔ اس کی

(باقی اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمایئے)

دنیا کے طاقتور ترین حاکم کو اپنی پارلیمنٹ کے سامنے کسی فعل کے بارے میں محض جھوٹ کی بنا پر اقتدار سے الگ ہونا پڑا۔ لیکن افسوس کہ اس خداداد مملکت میں آزادی رائے کا تحفظ تو درکنار لوگوں کے خلوت کدوں کو توڑ کر نکالا گیا ان کو مارا پیٹا گیا لیکن کسی کے کان پر شاید ہی جوں رینگی ہو۔ حتیٰ کہ نمائندگان کے اختلاف رائے کی بنا پر ان کی بہو بیٹیوں کی عزت و ناموس محفوظ نہ رہی۔ کوئی آواز اٹھائی گئی نہ احتجاج ہونے دیا گیا۔ یہی وجہ تھی کہ عوام نے اپنے حالات سے مجبور ہو کر ایک شخص کے ہاتھوں میں ارتکاز اختیار کے خلاف آواز اٹھائی اور پارلیمانی طرز حکومت کے حق میں ووٹ دیا۔[۴۱]

لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ قوم نے اپنے مخصوص حالات اور تجربہ کی روشنی میں بالغ رائے دہی کی بنا پر منتخب ہونے والی پارلیمانی طرز حکومت کے حق میں جو فیصلہ کیا وہ بلاشبہ سبیل المومنین ہے۔ اور وہی از روئے حدیث احسن فیصلہ ہے۔[۴۲] اور اس پر عمل پیرا ہونا شریعت کی رو سے ضروری ہوا۔ پھر اگر کسی وقت پارلیمانی جمہوریت کے وہ معائب جو فی الحال نظروں سے

حاشیہ بقیہ پچھلا صفحہ سے

علیحدگی امریکہ کے صدر نکسن پر کلنک کے ٹیکہ کی مانند ہے۔ واٹر گیٹ نے ثابت کر دیا کہ امریکہ میں انسانی بنیادی حق۔ رازداری کی کس قدر اہمیت ہے جو شخص اپنی بات کسی کو سنانی نہیں چاہتا دوسرے شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس کی وہ بات کسی طرح بھی سنے خواہ وہ سننے والا شخص ملک کی مقتدر ترین شخصیت ہی کیوں نہ ہو۔ یہ تعلیم بلاشبہ سورہ حجرات میں قرآن نے دی ہے۔ (ولا تجسسوا) لیکن افسوس صد افسوس اس پر عمل کی ہمیں توفیق نہیں۔

۴۱۔ صدر محمد ایوب کے دور کے آخر میں گول میز کانفرنس میں پارلیمانی طرز حکومت اور بالغ رائے دہی کی بنیاد پر نمائندگان عوام کے چناؤ کا فیصلہ ہوا۔

۴۲۔ جیسا کہ حدیث گذر چکی ہے کہ
"ما راٰہ المسلمون حسنا فھو حسن"

اوجھل ہیں۔ ظاہر ہو جائیں اور ان کی بنا پر قوم پھر فیصلہ کر لے کہ صدارتی یا کسی اور طرز کا نظام اپنایا جائے۔ تو بلاشبہ وہ اسلام کے منافی نہیں ہو گا۔ گویا ایک وقت قوم میں کسی مسئلہ پر اجماع ہوا۔ پھر کسی دوسرے وقت میں کسی دوسرے مسئلہ پر جو کہ پہلے سے سراسر مختلف ہے تو شریعت کی رو سے یہ کوئی ناجائز کام نہیں ہو سکتا۔ مثلاً بالفرض اگر قوم کسی وقت یہ فیصلہ کر لے کہ وہ فلاں شخص کو تاحیات سربراہ مقرر کرتی ہے اور اس کے بعد فلاں آدمی کو اس کا جانشین مقرر کرے گی تو یہ فیصلہ بھی جائز ہو گا۔ تاآنکہ اس میں قوم بلاجبر و اکراہ فیصلہ کرے۔

بعض لوگ مغربی جمہوریت کی مخالفت اس بنا پر کرتے ہیں کہ اس میں مستقل طور پر معاشرے میں دھڑے بندیاں (سیاسی پارٹیاں) ہو جاتی ہیں کم ازکم دو دھڑے بندیاں حزب اختلاف اور حزب اقتدار کا وجود تو لازم ہوتا ہے ہی جبکہ اسلام میں صرف ایک پارٹی حزب اللہ ہو سکتی ہے یا دوسری پارٹی حزب الشیطان ہوتی ہے۔ لہذا یہ نظام اسلام سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتا۔

یہ کہنا کہ اسلام میں صرف ایک ہی پارٹی (حزب اللہ) کے وجود کا جواز ہے صحیح نہیں اصل میں حزب اللہ شیطان کے مقابلے میں اللہ کی پارٹی ہے جو اس کے ماننے والے لوگوں کی نشاندہی کرتی ہے۔ جو اس کی حاکمیت کے تحت زندگی بسر کرنے والوں کی نشاندہی کرتی ہے۔ مسلمانوں کی سیاسی پارٹیوں کی تعداد سے مراد یہ ہے کہ اپنے سیاسی معاملات چلانے کے لئے کسی ایک فکر کے حامل لوگ باہم اشتراک سے کسی مسئلہ کو حل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر اسلام کی رو سے فقہی زاویۂ نظر اور شرعی معاملات میں کئی مؤقف ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ تاریخ شاہد ہے کہ ہماری فقہ میں متعدد طرز ہائے فکر کے وجود کو خلاف اسلام نہیں سمجھا گیا تو پھر مختلف سیاسی لائحہ ہائے عمل کے لئے مختلف مکاتب فکر کو اسلام سے متصادم کیوں سمجھا جاتا ہے۔ کسی معاشرے کے سیاسی معاملات کے سلجھاؤ کے لئے ہم خیال لوگوں کا باہم مل جانا اور منظم ہو جانا سیاسی پارٹیوں کو جنم دیتا ہے۔ اس لئے اگر اسلامی

معاشرے میں اسلام کے بنیادی اصولوں پر عقیدہ رکھتے ہوئے مختلف الخیال لوگ کسی مسئلہ کے حل یا مقصد کے حصول کے لئے متحد اور منظم ہو کر سرگرم عمل ہونا چاہیں تو اس میں کونسی بات اسلام کے خلاف ہو جاتی ہے۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ فقہاء عظام تابعین صحابہ کرام بلکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مقدسہ کے دوران غیر منصوص معاملات میں اختلاف آراء ہوتا رہا اور اس اختلاف کو کبھی اسلام کے منافی نہیں کہا گیا حقیقت تو یہ ہے کہ اس قسم کے اختلاف رائے کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے "اختلاف امتی رحمۃ" قرار دیا گیا ایسا اختلاف اسلام کی فعالیت ترقی پسندی یسر اور آفاقیت کی علامت ہے فقہائے کرام نے اختلاف رائے بشرطیکہ وہ معقول، مدلل اور للہیت پر مبنی ہو، کبھی برا نہیں سمجھا۔ بلکہ اس کے برعکس دلیل مخالف کا احترام بھی کیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اختلاف رائے نے اسلام کے دامن کو نقطہ آفرینیوں سے مالا مال کیا ہے۔ اور قانونی موشگافیوں کا باعث ہوا ہمارے فقہاء کرام اور اسلاف کے ان ذخائر کو دیکھ کر بلاشبہ ہم میں احساس اعتماد ابتہاج پیدا ہوتا ہے۔ کہ کس طرح انہوں نے آج سے سینکڑوں سال قبل قانونی جزئیات دے کر ہمارے علمی سرمائے کو مالا مال کیا ہے۔ اس نقطہ آفرینیوں کی وجہ سے اسلامی تحریک ہر دم تازہ اور رواں چلی آرہی ہے۔ دیگر مذاہب اور ادیان کے مسخ ہو جانے اور اپنی اولین تعلیمات سے منحرف ہو جانے کی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان میں اختلاف رائے کی گنجائش نہیں تھی ان مذاہب میں اسی طرح سوچ کے سوتے بند ہو کر رہ گئے۔ افکار زنگ آلود ہو گئے اس کے برعکس فقہائے اسلام نے ایسی نام نہاد یک رنگی اور یک آہنگی کو ہرگز پسند نہیں کیا۔ (۴۲)

۴۲۔ جیسا کہ حضرت امام مالک سے منسوب یہ روایت ہے کہ خلیفہ ہارون الرشید نے مؤطا امام مالک کو سرکاری طور پر نافذ کر کے اسے سرکاری فقہی مسلک قرار دینے کی تجویز پیش کی تو امام عالی مرتبت نے خلیفہ کی رائے سے یہ کہہ کر اتفاق نہ کیا کہ اس طرح دیگر مسالک کے پیروکاروں کے لئے

(باقی اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے)

لہٰذا اسلام کے بنیادی اصولوں پر ایمان رکھنے کے بعد اجتہادی اور غیر منصوص مسائل کے حل کے لئے اختلاف رائے کی کامل آزادی فراہم کرنے کے لئے متعدد سیاسی جماعتوں کے وجود کا اسلام مخالف نہیں۔

اسلامی معاشرے میں ایک ہی جماعت کے حامیین کی دلیل کو اگر اس بنا پر تسلیم کر لیا جائے کہ آنحضرت کے عہد میں مومنین کی جماعت کے علاوہ کوئی دوسری جماعت نہیں تھی لہٰذا اس وقت بھی ایک سے زائد جماعتوں کا جواز نہیں ہے۔ تو پھر لامحالہ طور پر ان تمام اداروں کو ختم کرنا پڑے گا جو آپؐ کے عہد میں موجود نہیں تھے لیکن اب ہو گئے ہیں مثلاً اس وقت ملت مسلمہ کی ایک ہی ریاست تھی اور ہر کلمہ گو اس ریاست کا شہری ہوتا تھا اور دنیا کے کسی بھی گوشہ سے آنے والے کلمہ گو کو اس میں آنے اور بسنے کی اجازت ہوتی تھی اور دارالاسلام کی سرحدیں اس کے لئے کھلی ہوتی تھیں۔ کیا یک جماعتی اسلامی معاشرے کے حامل ہمارے مہربان یہ اجازت دیں گے کہ وہ کرۂ ارض کے تمام مسلمانوں کو سعودی عرب میں یا کسی اسلامی مملکت میں بلا روک ٹوک بسنے اور آنے جانے کی آزادی ہونی چاہیئے۔ اور اسلامی ممالک نے پاسپورٹ وغیرہ اور غیر ملکی مسلمانوں کی آمد پر جو پابندیاں عائد کر رکھی ہیں یہ ختم ہونی چاہئیں۔ اور کیا اس آزادی سے ملت مسلمہ میں مسلمان حکومتوں کو چین نصیب ہو سکتا ہے؟ اور وہ سکون سے ملت مسلمہ کے لئے کوئی فلاح و بہبود کا کام انجام دے سکیں گی؟

حج بیت اللہ اسلام کا اہم رکن ہے اور صاحب استطاعت پر فرض ہے۔ [۴۴]

حاشیہ بقیہ پچھلا صفحہ سے

آزادی رائے کے مواقع مسدود ہو کر رہ جائیں گے۔ ملاحظہ ہو تاریخ تشریع الاسلامی از محمد خضری نیز احیاء علوم الدین امام غزالی و ضحی الاسلام از احمد امین بک مصری

۴۴- وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا۔ (سورہ آل عمران - ۹۰)

حدیث شریف میں استطاعت کے باوجود حج نہ کرنے کی وعید میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا ہے کہ ایسا شخص یہودی ہوکر مر جائے یا نصرانی ہوکر مر جائے اس میں کوئی فرق نہیں۔ (۴۵)

اس وقت تمام اسلامی حکومتوں کی طرف سے حاجیوں کی تعداد مقرر ہے اور کسی ملک کے تمام عازمین حج کو شائد ہی بلا روک ٹوک حج کی اجازت ملتی ہو۔ اس کے لئے بعض ممالک کی طرف سے ایسی پابندیاں عائد ہیں کہ ان پابندیوں کی وجہ سے بسا اوقات کئی کئی سال تک حج کی سعادت لوگوں کو نصیب نہیں ہوتی اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عازمین حج کی درخواستوں کی منظوری کے انتظار میں راہئ ملک عدم ہو جاتے ہیں۔ علمائے کرام، دانشور حضرات اور تمام اہل علم و فضل میں کتنے حضرات نے عازمین حج کی تعداد اور کوٹہ یہ ناجائز یا حرام ہونے کا فتوٰی دیا ہے۔ اسی طرح بے شمار مثالیں ایسی پیش کی جا سکتی ہیں۔ جو اس امر کی شاہد ہیں کہ امت مسلمہ نے حالات و زمانہ کی رعایت سے بہت سے معاملات میں ماثور طرز عمل سے ہٹ کر لائحہ عمل اختیار کیا لیکن اس سے ہرگز یہ استنباط نہیں ہوتا کہ نعوذ باللہ ہمارے اسلاف نے ان معاملات میں راہ حق سے روگردانی کی یا دین کی روح کو سمجھا نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے دین کی منشاء اور روح کو سمجھ کر ہی اجتہاد کر کے اسے اپنے وقت کا بہترین ضابطۂ حیات ثابت کیا۔ مثلاً فقہ کا یہ بنیادی کلیہ ہے کہ ضرورت ممنوع چیز کو بھی مباح قرار دے دیتی ہے (۴۶)۔ اسی طرح قرآن مجید نے یہ بتایا ہے اللہ تعالٰی تمہارے لئے سہولت چاہتے ہیں اور تنگی نہیں چاہتے (۴۷)۔ اور پھر اسی اصول پر مبنی حدیث نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے کہ "دین آسانی ہے" (۴۸)۔ فقہاء نے

۴۵۔ ملاحظہ ہو مشکوٰۃ حدیث نمبر ۲۴۰۷ تا ۲۴۲۰

۴۶۔ الضرورات تبیح المحظورات (ملاحظہ ہو الاشباہ والنظائر) جلال الدین سیوطی صفحہ ۶۰ و ابن نجیم صفحہ ۳۴ یا امام غزالی وجیز۔ ج ۲ صفحہ ۲۱۶۔

۴۷۔ یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر (سورۃ البقرہ آیت ۱۸۵)۔

۴۸۔ الدین یُسر۔

امت نے ان اصولوں کی بنا پر بہت سے معاملات میں سہولت کی اجازت دی ہے یا بالفاظ دیگر وہ کون سے حالات ہیں جن میں فقہائے امت نے احکام میں تبدیلی کی اجازت دی ہے۔ اس کے بارے میں فقہائے کرام کی بہت سی تصانیف موجود ہیں[۴۹] جن میں اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ ان فقہائے کرام نے احکام شرع کی دو اقسام قرار دی ہیں اول عبادات ثانی معاملات دنیوی۔

عبادات کے بارے میں تو ان حضرات کی مباحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کی عبادات سے بے نیاز ہے نہ اسے فرمانبرداروں کی اطاعت سے فائدہ ہو سکتا ہے نہ گنہگاروں کے گناہوں سے نقصان[۵۰]۔

معاملات دنیا کے متعلق ان کی گفتگو کا لب لباب یہ ہے کہ دین میں معاملات کے مقاصد معقول اور حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان میں اصل یہ ہوتی ہے کہ مفید اشیاء مباح ہوتی اور نقصان دہ ممنوع ہوتی ہیں[۵۱]۔ اس سلسلے میں ابن القیم الجوزی کا قول سب سے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ شریعت کی بنیاد حکمتوں اور لوگوں کی دنیاوی، اخروی فلاح و بہبود پر ہے اور شریعت کاملا انصاف سراسر رحمت اور حکمت ہے پس جس مسئلہ پر انصاف کے بجائے ظلم ہو، رحمت کی بجائے زحمت ہو۔ فائدے کی بجائے نقصان ہو، عقل کی بجائے بے عقلی ہو، وہ شریعت کا مسئلہ نہیں اگرچہ اسے تاویلا شریعت میں داخل کر لیا گیا ہو پس شریعت خدا کے بندوں میں اس کا انصاف اور

۴۹۔ عزبن عبدالسلام شافعی، ابن القیم الجوزیہ، حنبلی ابو اسحاق شاطبی مالکی، ابو یوسف حنفی، امام شہاب الدین ابوالعباس احمد بن ادریس قرآفی امام نجم الدین ابوالربیع سلیمان بن عبدالقوی طوفی کی کتب قواعد الاحکام اعلام الموقعین، موافقات والاعتصام کتاب الخراج وغیرہ۔

۵۰۔ ملاحظہ ہو قواعد الاحکام لعزبن عبدالسلام ج ۲ ص ۷۰۔

۵۱۔ واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض فاما الزبد فیذھب جفاء (سورہ رعد)

مخلوق میں اس کی رحمت ہے۔ اس سے زندگی ہے غذا ہے دوا ہے، نور ہے، شفا ہے، اور حفاظت ہے۔ زندگی کی ہر بھلائی شریعت سے وابستہ ہے اور زندگی کے ہر نقصان کا سبب ترک شریعت ہے[۵۲]۔

دنیا کی انقلاب پذیری میں معاشرۂ انسانی کے معیارات فلاح و بہبود اور نفع و ضرر بھی متغیر ہے۔ چنانچہ ان تغیرات کے مطابق احکام شریعہ میں تبدیلی، اختلاف زمان و مکان احوال و ظروف اور عادات بشریہ میں تبدیلی کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ تبدیلیٔ حالات کے ساتھ تبدیلیٔ احکام کی یوں تو بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن بخوف طوالت چند ایک پر اکتفا کیا جائے گا قبل اس کے یہ مثالیں پیش کی جائیں – مندرجہ ذیل دو امور اصولی طور پر پیش نظر رکھے جائیں گے۔

۱۔ "یہ کہ جمہور فقہائے مجتہدین نے تبدیلی احکام کے اصول کو تو تسلیم کر لیا ہے لیکن جب کسی مسئلے کے متعلق قرآن یا سنت کی نص قطعی موجود ہو تو اس صورت میں اختلاف ہے مثلاً اگر قرآن و سنت کا کوئی حکم دین و عبادت سے متعلق ہو تو وہ اس وقت تک باقی رہے گا جب زمین، زمین ہے اور آسمان آسمان (قیامت تک)، کیونکہ اصول دین اور توحید و ایمان کے ضابطے حقیقی ہیں اور ناقابل تبدیلی نیز ازلی و ابدی ہیں۔ ان تمام کے حکم میں نص کے حکم کی اطاعت لازمی ہے۔ اور چونکہ دین ہر متنفس اور ہر اس شخص کے لئے جو روئے زمین پر پیدا ہوا ہے قیامت تک ہے ضروری ہے لہٰذا اس پر زمان و مکان اور حالات کی تبدیلی کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ لہٰذا وہ ہر زمانے میں ہر جگہ اور ہر حال میں باقی رہے گا"[۵۳] لیکن قرآن و سنت کا جو حکم معاملات دنیا سے متعلق ہو ان کے بارے میں اصول یہ ہے کہ اس کا منشاء مفہوم اور

۵۲۔ اعلام الموقعین

۵۳۔ ملاحظہ ہو فلسفہ شریعت اسلام۔ از صبحی محمصانی ص ۲۴۰ تا ص ۲۴۸۔

اسباب وعلل پر غور کیا جائے گا۔ پس اگر ان میں مصالح عامہ ہوئی تو اس کے پیش نظر اس میں تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ (۵۴)

۲۔ یہ امر بھی تسلیم شدہ ہے کہ قرآن اور حدیث دونوں میں عمل نسخ تسلیم کیا جاتا ہے (۵۵) اور یہ عمل ایک نص سے دوسری نص میں ترمیم واضافہ شمار ہوتا ہے۔

مندرجہ تصریحات کے تابع ہم حالات زمانہ کی تبدیلی سے احکام میں تبدیلی کی مثالیں عرض کرتے ہیں۔

قرآن کریم نے مصارف زکوٰۃ سورہ توبہ کی آیت کریمہ ۶۰ میں آٹھ متعین کر دیئے ہیں ان میں سے چوتھا مصرف المؤلفۃ قلوبھم بھی ہے۔ مولفۃ قلوبھم وہ مسلمان یا غیر مسلمان لوگ تھے جنہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس لئے خیرات عطا فرمایا کرتے تھے کہ ان کی دل جوئی کر کے انہیں اسلام پر قائم رکھیں دل جوئی خواہ ان کے ضعف ایمان سے ہو یا ان کے دفع شر یا ان کے قبیلے میں اثر و رسوخ سے۔ باوجود صریح نص قرآنی کے حضرت عمر بن خطاب نے مؤلفۃ القلوب کا حصہ موقوف کر دیا اور فرمایا کہ یہ حصہ تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس لئے دیتے تھے کہ تمہاری دلجوئی سے تمہیں اسلام پر قائم رکھیں۔ اور تم اسلام یا مسلمانوں کو نقصان نہ پہنچاؤ۔ اب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو طاقتور بنا دیا ہے اور تم سے بے نیاز کر دیا ہے پس اگر تم اسلام پر قائم رہو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ ورنہ ہمارے اور تمہارے درمیان تلوار فیصلہ کرے گی۔ (۵۶) ہم

۵۴۔ ان الحکم الشرعی المبنی علی علتہ یدور علی علتہ وجودا وعدما۔ ملاحظہ ہو۔ المنافع شرح الجامع ان الحکم الشرعی مبنی علی علتہ فبنھا یتھا ینتھی لاینکر تغیرا لاحکام بتغیر الزمان۔ مجلہ الاحکام العدلیہ مادہ (۳۹)

۵۵۔ ملاحظہ ہو آیت کریمہ ما ننسخ من آیہ او ننسھا نات بخیر منھا او مثلھا آیت ۱۰۶۔ سورہ بقرہ۔

۵۶۔ ملاحظہ ہو تفسیر طبری مذکورہ آیت۔

اسلام کے معاوضے میں تمہیں کچھ نہیں دیں گے۔ لہٰذا جس کا جی چاہے اسلام لائے اور جس کا جی چاہے کافر ہو جائے۔

نزول وحی کے وقت اس آیت کریمہ کا حکم اشاعت و حفاظت دین تھا۔ لوگ کمزور تھے لوگوں کی ہمدردیوں اور طاقتور دشمنوں کے دفع شر کی ضرورت تھی۔ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں اسلام اس قدر طاقتور ہو گیا تو ایسے لوگوں کی ہمدردیاں یا دفع شر بے معنی ہو کر رہ گئی چنانچہ حضرت عمرؓ نے اس حکم کو منسوخ کر دیا جو اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے دیا گیا تھا۔

۲۔ اسی طرح قرآن کریم نے جنگ کے مال غنیمت کی تقسیم بتا دی ہوئی ہے۔ اس میں عہد نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) اور غرباء کے لیے خمس مقرر کیا گیا[۵۷] بقیہ چار حصے جنگ میں شریک مجاہدین کا حصہ ہوتے تھے۔ عہد نبوی و صدیقی میں اس تقسیم کے مطابق عمل ہوتا رہا۔ عہد فاروقی میں بھی ابتداً اسی پر عمل ہوتا رہا بعد میں مال غنیمت کی فراوانی ہو گئی اور عراق فتح ہوا تو حضرت عمرؓ نے عراق کی زمینیں مجاہدین میں تقسیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر تمام صحابہ کرامؓ کو اس کا قائل کر لیا کہ وہ زمینیں مجاہدین کی بجائے مملکت کی ملکیت میں رہنے دی جائیں چونکہ اگر اس طریق پر مال غنیمت کی تقسیم ہوتی رہی تو ایک طرف دولت صرف چند لوگوں میں مرتکز ہو کر رہ جائے گی جو کہ قرآن کریم کے اصول کے خلاف ہوگی۔[۵۸] دوسری طرف آپ نے فرمایا کہ آنے والی نسلوں کے لیے ہمارے پاس کیا رہے گا۔ چنانچہ آپ کی دلیل سے صحابہ کرام نے اتفاق کر لیا اس فیصلہ کے مطابق عراق کی مفتوحہ زمینیں سابقہ قابضین کے تصرف میں رہنے دی گئیں اور اس کا سالانہ خراج بیت المال کا حصہ قرار پایا۔

۵۷۔ واعلموا انما غنمتم من شیء فان للہ خمسہ وللرسول ولذی القربیٰ والیتامیٰ والمساکین وابن السبیل۔ (سورہ انفال ۸۔ آیت ۴۱)

۵۸۔ کی لا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم (سورہ حشر ۵۹۔ آیت ۷)

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور عہد صدیقی میں ایک ہی نشست میں دی ہوئی ایک سے زیادہ طلاقیں ایک ہی متصور ہوتی تھیں حضرت عمر کے عہد میں بھی ابتداءً یہی حکم رہا لیکن بعد میں اس مسئلہ پر حضرت عمر نے محسوس کیا کہ لوگوں نے اس قسم کی طلاق کو ایک کھیل بنا لیا ہے۔ اور ایسی طلاقیں بکثرت دی جانے لگی ہیں تو آپ نے ان کو ایسی بری عادت سے روکنے کے لئے ایک ہی نشست میں ایک سے زیادہ طلاقوں کو بائن قرار دے دیا۔ امت نے اس پر اتفاق کر لیا۔[۵۹]

۴۔ عاقلہ کی جدید تشکیل۔ قتل کا خون بہا ادا کرنے کے لئے عہد نبوی کے دوران اس سے قبل اور عہد صدیقی میں قاتل کی عاقلہ ہوتی تھی۔ لیکن حضرت عمر فاروق نے اپنے عہد میں جب فوج کی تنظیم کی اور دیوان مرتب کئے تو قبیلہ کے بجائے اہل دیوان کو عاقلہ قرار دے دیا اس پر صحابہ نے اتفاق کر لیا۔ وجہ یہ تھی کہ ابتداءً کسی شخص کا قبیلہ اس شخص کی طاقت اور اثر و رسوخ کی وجہ ہوتا تھا بعد میں جب قبائل کی قوت اور اثر کم ہو گیا تو جنگی طاقت قبائل سے منتقل ہو کر محکمہ فوج کے ہاتھ آ گئی۔ اس لئے حضرت عمر نے خون بہا قاتل کے قبیلہ کے بجائے اہل دیوان پر ڈال دیا۔

۵۔ اسی طرح ذمی کے خون بہا کے سلسلے میں حالات و زمانہ کے بدلنے سے تبدیلی واقع ہوتی رہی۔ مثلاً عہد نبوی، صدیقی، فاروقی اور عثمانی کے دوران یہودیوں اور نصرانیوں کا خون بہا مسلمان کے خون بہا کے برابر ہوا کرتا تھا۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک مسلمان اور ذمی کا خون بہا برابر ہے۔ امام مالک اور امام حنبل کے نزدیک مسلمان سے نصف ہے اور امام شافعی کے نزدیک مسلمان کا تیسرا حصہ ہے حضرت امیر معاویہ نے اپنے عہد میں ذمی کے خون بہا کا نصف مقتول کے ورثاء اور نصف بیت المال کے لئے مقرر کر دیا تھا۔ حضرت

۵۹۔ ملاحظہ ہو فقہ عمراز شاہ ولی اللہ دہلوی (اردو ترجمہ)

عمر بن عبد العزیز نے ورثار کا نصف رہنے دیا اور بیت المال کا نصف معاف کر دیا تھا۔ دو خلفار کا عمل سنت اور عمل صحابہ سے مختلف تھا اور یہ تبدیلی اس وقت کی سیاست کا تقاضا تھا۔[۶۰]

۶۔ بعینہٖ حضرت امام ابو حنیفہ کی ایک مثال ہے کہ عہد اسلامی کے دور اوّل کے دوران اساتذہ کے بڑے بڑے وظائف مقرر تھے اس بنا پر امام ابو حنیفہ اور صاحبین نے قرآن مجید اور دینی تعلیم کی تدریس کی اُجرت ممنوع قرار دے دی۔ مگر جب اساتذہ کے وظائف موقوف ہو گئے تو متاخرین فقہار نے رواج بدل جانے کے سبب اس قسم کی اجرت کے جواز کا فتویٰ دے دیا۔[۶۱]

۷۔ اسلام نے کسی مرہونہ مکان کے انتفاع (کرایہ) کو ممنوع قرار دیا ہے۔ چونکہ یہ سود کے مترادف ہے قرون وسطیٰ میں بخارا کے مسلمانوں کے مخصوص مالی حالات کے پیش نظر ایسی ضرورت پیش آئی اور لوگوں نے اس سے بچنے کے لئے مشروط بیع کا ایک معاہدہ رواج دے دیا۔ یعنی کوئی شخص کسی کے ہاتھ اس شرط پر اپنی جائیداد فروخت کرتا کہ مشتری کسی مقررہ مدت کے بعد اس بائع کو وہ مکان فروخت کرے

۶۰۔ ملاحظہ ہو فلسفہ شریعت اسلام از صبحی محمصانی (۲۳۷ تا ۲۴۲)

۶۱۔ اسی طرح بہت سی دیگر مثالیں کتب سیر و تواریخ اور فقہ میں ملتی ہیں لیکن بخوف طوالت ان کا ذکر نہیں کیا جا رہا ہے مثلاً یہ کہ ام ولد کی بیع کی ممانعت زانی کی سزا میں ایک سال کی جلا وطنی کی موقوفی بیت المال کی جعلی مہر بنانے والے ملازم کی سزا سو کوڑے مقرر کی گئی حالانکہ حدیث کی رو سے حد کی سزا کے برابر تعزیر نہیں دی جا سکتی۔

گا اس کو بیع بالوفا کا نام دیا گیا۔ وہاں کے فقہاء نے اس کے جواز کا فتویٰ دے دیا۔[۶۲] وجہ یہ ہوئی تھی کہ بخارا کے مسلمان بری طرح زیر بار ہو گئے تھے چنانچہ اگر اس قسم کی بیع کی اجازت نہ دی جاتی تو ان کی جائیدادیں بک جاتیں اور وہ قلاش اور مفلس ہو کر رہ جاتے ان حالات میں وہاں کے مخصوص حالات کے پیش نظر علمائے بخارا نے مخصوص یا متعین مدت کے بعد فروخت شدہ املاک کو سابقہ مالک کو ہی لوٹانے کی شرط کو جائز قرار دے دیا۔

امام ابو حنیفہ اور امام محمد کے نزدیک حکم شرع کا اتباع واجب ہے نہ کہ جدید رسم و رواج کا لیکن قاضی ابو یوسف کو چونکہ زندگی کے کٹھن حقائق سے بحیثیت قاضی واسطہ پڑ چکا تھا اس لئے حضرت عمر کی طرح ان کی رائے زیادہ حقیقت پسندانہ معلوم ہوتی ہے آپ کے نزدیک رسم و رواج بدل جانے سے استحساناً حکم شرع ترک کر دینا اور رواج کا اتباع ضروری ہے، کیونکہ ایسی صورت میں حکم شرع کا مطمح نظر بھی رسم و رواج تھا مجلہ نے بھی اس رائے کو اختیار کیا ہے مثلاً آنحضرت کے عہد میں جو اور گندم کیلی اور ملینے کی چیزیں ہوتی تھیں[۶۳] یہ لیکن بعد میں یہ وزن کر کے بیچی جانے لگیں چنانچہ امام ابو یوسف نے بھی ان کے حق میں فتویٰ دے دیا۔

خلاصۂ کلام

۱۔ سطور بالا میں کی گئی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کے لئے کسی خاص قسم کا طرز حکومت مقرر نہیں کیا بلکہ اس کا تعین ہر دور کے مسلمانوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا کہ وہ

۶۲۔ ملاحظہ ہو المجلۃ الاحکام العدلیہ مادہ ۳۲) سر عبدالرحیم کی محمڈن جیورس پروڈنس نیز فلسفہ شریعت اسلام، نیز اسلامک جیورس پروڈنس اینڈ دی رول آف نے سیسیٹی اینڈ سٹیٹ از ڈاکٹر محمد مصلح الدین فاروقی۔

۶۳۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے البر بالبر کیلاً بکیل والشعیر بالشعیر کیلاً بکیل ملاحظہ ہو۔ المغنی لابن قدامہ جلد ۴ ص ۱۳۶

اپنے حالات زمانے کے مطابق جو طرز حکومت مناسب خیال کریں اپنا لیں۔ لیکن یہ اصول ضرور متعین کر دیئے کہ ارباب بست دکشاد مسلمانوں کے معاملات مملکت شوروی طرز پر چلائیں ریاست فلاحی ہو اور اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ امر بالمعروف نہی عن المنکر کے قیام کی ذمہ دار ہوگی۔ بنی نوع انسان کی مجموعی فلاح و بہبود اور آسانی کو ملحوظ رکھے۔ انسانوں میں رنگ و نسل، قوم، علاقہ، دین وغیرہ کی بنا پر کسی قسم کا امتیاز نہ برتے۔ اسلام کا مقصد ہی دنیا میں امن و سلامتی کا قیام ہے لیکن ایسی امن و سلامتی ترغیب و تحریص اور افہام و تفہیم سے ہو۔ جبر و کراہ سے نہ ہو۔ عدل و انصاف قائم کیا جائے۔ اور اس میں کسی قسم کی رعایت یا عداوت کا دخل نہیں ہونا چاہیئے۔ حکمران خواہ کسی طریق پر چنا جائے یا برسر اقتدار آ جائے اسے اسلام کے بتائے ہوئے مذکورۃ الصدر اصولوں کے مطابق حکومت چلانی چاہیئے۔

۲۔ جن معاملات میں قرآن و سنت میں کوئی رہنمائی نہ ملتی ہو ان میں اجتہاد کے ذریعے رہنمائی حاصل کی جائے۔

۳۔ ملت مسلمہ کے اجتماعی مسائل میں فلاح عامہ کا خیال رکھا جائے اور جو امور کہ ملت مسلمہ کی اکثریت مستحسن سمجھتی ہو ان کو بہتر سمجھا جائے اور اکثریت کی رائے کے مطابق عمل کیا جائے۔

۴۔ تبدیلی حالات سے اگر مصالح عامہ کے تقاضے بدل جائیں تو ملت بیضا کی بہتری کے لئے احکام میں دین کی روح اور تقاضوں کے مطابق تبدیلی کر کے فلاح عامہ کا خیال رکھا جائے

۵۔ لہٰذا اس وقت مسلمانوں کے حکمرانوں کے چناؤ کے لئے جو بہترین طریق کار مروج ہے وہ یہی ہے کہ قوم کے صحیح الدماغ بالغ حضرات کی رائے کے مطابق ان کا چناؤ ہو اور جب تک قوم کی اکثریت کی حمایت کسی حکمران کو حاصل رہے حکمران کو برسر اقتدار رہنا چاہیئے جب اکثریت اس کے خلاف ہو جائے تو اسے حکومت اس جماعت یا افراد کو سونپ دینی چاہیئے جنہیں اکثریت کا اعتماد حاصل ہو۔

صدارتی طرز حکومت اسلامی ہے نہ پارلیمانی صرف پاکستان کی موجودہ اکثریت نے واضح

طور پر کثرت رائے سے اس امر سے اتفاق کر لیا ہوا ہے اور ابھی تک اس رائے سے اس نے رجوع نہیں کیا کہ یہاں پر پارلیمانی طرز حکومت رائج ہونا چاہیئے۔ اور حکمرانوں کے چناؤ کے لئے ۲۱ سال کے صحیح الدماغ بالغ افراد کی رائے خفیہ طور پر لے کر چناؤ ہونا چاہیئے لہذا یہی پاکستان کے رہنے والے مسلمانوں کی بہتری کا حامل نظام ہے۔

۷۔ جب تک امت مسلمہ پاکستانیہ کی اکثریت مذکورہ بالا رائے سے رجوع نہیں کرتی اسلام کی رو سے ہمارے لئے اس رائے پر عمل ضروری ہے۔ اور جو لوگ اس کی مخالفت کر رہے ہیں وہ نہیں چاہتے کہ پاکستان کے حکمرانوں کی تبدیلی پر امن طور پر جمہوری طریقے سے عمل میں آیا کرے اور یہاں سے مطلق العنانیت، استبداد کا خاتمہ ہو۔ اور ملک صحیح معنوں میں فلاح و ترقی کے راستے پر گامزن ہو، بلکہ یہ لوگ کاسہ لیس قماش کے ہیں جو ہر چڑھتے سورج کے پجاری ہیں اور ہر حکمران کو یہی مشورہ دیا کرتے ہیں کہ آپ سب سے اعلیٰ و ارفع برتر اور عقل کل ہیں عوام جاہل ان پڑھ ناسمجھ ہیں۔ ان کو جانوروں کی طرح ہانکتے چلا جانا آپ کا حق ہے۔

۸۔ اسلام میں امور مملکت میں مشورہ لینے کی جو مثالیں ملتی ہیں ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا خلفائے راشدین نے کبھی کسی مخصوص طبقے کے لئے مشورہ محدود نہیں رکھا بلکہ اس میں ہر اعلیٰ و ادنیٰ عالم و عامی کو حق رائے دہی حاصل رہا۔ اور مشاورت عامہ میں داخلہ کے لئے کبھی کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی۔

مصادر و مراجع

تفاسیر. طبری ۔ معارف القرآن ۔ تدبر قرآن ۔ تفسیر ماجدی
(مفتی محمد شفیع مرحوم) ۔ (مولانا امین احسن اصلاحی) (مولانا عبدالماجد دریا بادی)

۱۔ مشکواۃ المصابیح
ابو محمد حسین بن مسعود فراء بغوی، شیخ ولی الدین محمد بن عبداللہ خطیب عمری۔
اُردو ترجمہ :۔ تاجران کتب "قرآن محل" کراچی۔

۲۔ عمدۃ القاری
شرح صحیح بخاری از علامہ بدر الدین العینی۔

۳۔ فتح الباری بشرح البخاری
حافظ شہاب الدین ابوالفضل العسقلانی المعروف ابن حجر مطبوعہ شرکتہ مکتبہ و مطبعہ مصطفی البابی واولادہ مصر۔

۴۔ تاریخ طبری
(تاریخ الامم والملوک) از ابن جریر الطبری۔
اُردو ترجمہ سید محمد ابراہیم ۔ مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی (۱۹۶۷ء)

۵۔ سیرت النبی ابن ہشام
(ابو عبدالملک بن عبدالجلیل صدیقی ہشام) اُردو ترجمہ شیخ غلام علی اینڈ سنز۔

۶۔ سیاست شرعیہ
از رئیس احمد جعفری ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور پاکستان ۔ سیرت خلفائے راشدین از معین الدین ندوی مطبع معارف دار المصنفین اعظم گڑھ مطبوعہ ۱۳۴۶ ہجری۔

۸۔ **ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء**

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی ،

اُردو ترجمہ مولانا عبدالشکور ، مولانا انشاء اللہ ، مطبوعہ محمد سعید اینڈ سنز تاجران کتب کراچی ۔

۹۔ **حجۃ اللہ البالغہ**

از شاہ ولی اللہ دہلوی ۔ اُردو ترجمہ ابو محمد عبدالحق حقانی ۔ ناشر نور محمد کارخانہ تجارت کتب آرام باغ کراچی ۔

۱۰۔ **سیرت النعمان**

از شبلی نعمانی ۔ ناشر ایم ثناء اللہ خان ، ریلوے روڈ لاہور ، مطبوعہ ۱۸۹۳ء

۱۱۔ **امام ابو حنیفہ**

عہد و حیات از ابو زہرہ ، اُردو ترجمہ رئیس احمد جعفری ، مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور

۱۲۔ **فقہ الاسلام**

از حسین احمد الخطیب اُردو ترجمہ سید رشید احمد ارشد ، نفیس اکیڈمی کراچی ۔

۱۳۔ **خلافت و ملوکیت**

از مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ، اسلامک پبلیکیشنز لاہور ، مطبوعہ ۱۹۶۶ء

۱۴۔ **طبقات ابن سعد**

(محمد بن سعد م ۲۳۰) ، اُردو ترجمہ عبداللہ بن العمادی ، نفیس اکیڈمی کراچی ۔

۱۵۔ **حقیقت خلافت و ملوکیت**

محمود احمد عباسی ۱۹۶۸ء ، ناشر مکتبہ محمود لیاقت آباد کراچی

۱۶۔ **تاریخ ابن خلدون** ۔ (اردو ترجمہ)

حکیم احمد حسین عثمانی ، نفیس اکیڈمی کراچی مطبوعہ ۱۹۴۹ء

۱۷۔ البدایہ والنہایہ

از ابوالفدا حافظ ابن کثیر، مکتبہ المعارف ومکتبہ النصر الریاض، مطبوعہ ۱۹۶۶ء

۱۸۔ الاشباہ والنظائر

مع شرح للعلامہ الحموی از ابن نجیم مطبوعہ منشی نول کشور لکھنؤ

۱۹۔ الاحکام فی اصول الاحکام

از حافظ ابومحمد علی ابن حزم الاندلسی، مطبعۃ الامام ۱۳۔ مصر۔

۲۰۔ المستصفی من علم الاصول

از ابوحامد محمد بن محمد الغزالی مطبع امیریہ دار صادر مصر۔

۲۱۔ ردالمحتار

محمد امین المعروف بابن عابدین، دارالطباعہ العامرہ۔

۲۲۔ المجلہ الاحکام العدلیہ

مطبوعہ کارخانہ تجارت کتب آرام باغ کراچی۔

۲۳۔ اسلام کا نظام حکومت

از مولانا حامد الغازی الانصاری، ندوہ المصنفین دہلی طبع ۱۹۵۶ء

۲۴۔ احیاء علوم الدین

از ابوحامد محمد بن محمد الغزالی۔

۲۵۔ ضحی الاسلام

از احمد امین بک مصری۔

۲۶۔ تاریخ تشریع الاسلامی

از محمد خضری

۲۷۔ احکام شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت

از مولانا محمد تقی امینی ، مطبوعہ سندھ ساگر اکادمی ۔ لاہور ۔

۲۸ ۔ العلم والعلماء

علامہ ابن عبدالبر کی مشہور تصنیف ، جامع بیان العلم وفضلہ
از مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ندوۃ المصنفین دہلی ۔

۲۹ ۔ کتاب الخراج

از امام ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم ، اردو ترجمہ نجات اللہ صدیقی ،
ناشر مکتبہ چراغ راہ، کراچی ۔

۳۰ ۔ فلسفہ شریعت اسلام

از صبحی محمصانی ، اردو ترجمہ محمود احمد رضوی ، ناشر مجلس ترقی ادب کلب روڈ لاہور

۳۱ ۔ فقہ عمر

رسالہ در مذہب فاروق اعظم مؤلفہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ، اردو ترجمہ ابو یحیٰی امام خان
نوشہروی ، ناشر ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۔

۳۲ ۔ المغنی

از ابو محمد عبداللہ بن احمد بن محمد موفق الدین ابن قدامہ ، مکتبہ القاہرہ ۔ مصر ۔

۳۳ ۔ کتاب الخراج

تالیف یحییٰ بن آدم القرشی (متوفی ۲۰۲) ، مطبوعہ المکتبہ العلمیہ لاہور ۔
طبع ۱۳۹۵ ہجری ۔

۳۴ ۔ فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر

از مولانا محمد تقی امینی اسلامک پبلیکیشنز لاہور ، طبع ۱۹۷۵ء پاکستان ۔

۳۵ ۔ ترجمان القرآن

(ماہنامہ) مجلات ۶۰ شمارہ جات ۱ تا ۶ ، اپریل تا ستمبر ۱۹۶۳ء

۳۶۔ علوم القرآن اور اصول تفسیر
مولانا محمد تقی عثمانی ، مکتبہ دار العلوم کراچی ، مطبوعہ ۱۳۹۶ ہجری۔

۳۷۔ اسلام کا اقتصادی نظام
مؤلف ، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ، ناشر ندوہ المصنفین دہلی ، مطبوعہ ۱۹۵۹ء

۳۸۔ سیرہ عمر بن عبدالعزیز
از ابو محمد عبد بن عبدالحکیم ، اُردو ترجمہ مولانا محمد یوسف لدھیانوی ، ناشر مکتبہ رشیدیہ شاہ عالم مارکیٹ لاہور ، مطبوعہ ۱۹۷۵ء۔

۳۹۔ الاحکام السلطانیہ
از امام ابوالحسن بن محمد بن حبیب البصری البغدادی الماوردی ، اُردو ترجمہ سید محمد ابراہیم (ندوی) ناشر نفیس اکیڈمی کراچی۔

۴۰۔ اسلام میں حریت، مساوات، اخوت
از خواجہ عباد اللہ اختر ، ناشر ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور مطبوعہ ۱۹۵۵ء

۴۱۔ تاریخ الخلفاء
حافظ جلال الدین السیوطی ، اُردو ترجمہ اقبال الدین احمد ، ناشر نفیس اکیڈمی ، طبع ۱۹۶۳ء کراچی۔

۴۲۔ ترجمان السنۃ
از مولانا محمد بدر عالم میرٹھی ندوہ المصنفین دہلی ، مطبوعہ ۱۹۶۲ء

۴۳۔ تاریخ فقہ مع عائلی قوانین واحکام میراث
از میاں منظور احمد پروفیسر اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور ،
ناشر علمی کتاب خانہ اُردو بازار لاہور۔

۴۴۔ الاشباہ والنظائر
جلال الدین سیوطی ، مطبوعہ

۴۵۔ تاریخ جمہوریت

از شاہد حسین رزاقی ، مطبوعہ ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور ۱۹۵۰ء

۴۶۔ خلافت راشدہ اور جمہوری قدریں

از رشید اختر ندوی

۴۷۔ خلافت و ملوکیت کی تاریخی و شرعی حیثیت

از صلاح الدین یوسف مطبوعہ مکتبہ سلفیہ لاہور ۱۹۷۰ء

۴۸۔ حضرت امیر معاویہ

از مولانا محمد تقی عثمانی ، مطبوعہ دارالاشاعت دارالعلوم لانڈھی کراچی۔

۴۹۔ الامامہ والسیاسة

ابو عبداللہ بن مسلم ابن قتیبہ الدینوری ، مطبوعہ مؤسسۃ الحلبی و شرکاء للنشر والتوزیع مصر

۵۰۔ العدالہ الاجماعیہ فی الاسلام

از سید قطب ، اسلام میں عدل اجتماعی اُردو ترجمہ ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی ، مطبوعہ اسلامک پبلیکیشنز شاہ عالم مارکیٹ لاہور

۵۱۔ شاہ ولی اللہ (دہلوی) کی تعلیمات

از غلام حسین جلبانی ، مطبوعہ شاہ ولی اللہ اکیڈیمی حیدر آباد سندھ